بکھرے موتیوں کا ہار

(افسانوں کا مجموعہ)

احمد مشکور

بکھرے موتیوں کا ہار

(افسانوں کا مجموعہ)

احمد مشکور

ناشر
ادارۂ گلبن ۔ 31-30 ۔ حسن گارڈن کالونی، کمتا، چنہٹ ۔ لکھنؤ ۔ 227105

نام کتاب : بکھرے موتیوں کا ہار (افسانوں کا مجموعہ)

مصنف : احمد مشکور

پتے : ۳/۲۰۱۔ کیرتی اپارٹمنٹ۔ میوروہار۔ فیز I۔ دہلی۔ 110091

۲۰۲۔ ایم۔ اے۔ اپارٹمنٹ، A17 کملا نہرو نگر، خرم نگر۔ لکھنؤ

تعداد : پانچ سو (۵۰۰)

قیمت : سو روپے (-/Rs. 100)

اشاعت سنہ : جنوری ۲۰۱۳ء

طباعت : ایلٹ پریس، بالدہ روڈ، لکھنؤ

کمپوزنگ : ہارون انصاری۔ ندا آرٹ۔ 9616202153

ملنے کے پتے : ☆ مشکور احمد صدیقی۔ ۳/۲۰۱، کیرتی اپارٹمنٹ، میوروہار

فیز I۔ دہلی۔ 91۔ موبائل: 9810428919

☆ ادارۂ گلبن۔ ۳۱/۳۰۔ حسن گارڈن کالونی

کمتا، چنہٹ۔ لکھنؤ۔ ۲۲۷۱۰۵

☆ ڈاکٹر مہہ جبیں عائشہ۔ احمد اسٹیٹ

اصطبل چارباغ۔ ۵۲۔ مولوی گنج لکھنؤ

☆ حسین امین۔ ۵۲۔ نیا گاؤں مغربی، امین آباد، لکھنؤ

☆ لائبریرین۔ ناصر لائبریری۔ اونچوا (ابو بازار) گورکھپور

......☆......

انتساب

اپنے عزیز ترین مرحوم دوست

سعد الدین احمد عندلیبؔ

کے نام

جنہوں نے میری قلمی صلاحیتوں کو پہچانا اور تصنیف و تخلیق کی ترغیب دی

اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں

اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

......☆......

احمد مشکور

ترتیب

افسانے:

تصانیف

۱۔ انجمن شمع ادب گورکھپور کی جانب سے کتابچہ ''نئی شمع نئے پروانے'' ساجدی پریس سے 1958ء میں شائع کیا۔

۲۔ جاسوسی ناول ''سونے کی لاش'' ظفر پبلی کیشن الہ آباد سے 1960ء میں شائع ہوئی۔

۳۔ بچوں کیلئے ناول ''ننھے جاسوس'' لکھی جو ثافی پبلی کیشن نے 1968 میں شائع کی۔

۴۔ امریکہ کے سفر کے مشاہدات بعنوان ''امریکن مسلم'' روزنامہ ''آگ'' لکھنؤ میں ۲۲ قسطوں میں شائع ہوئی اور اب کتابی شکل میں مشہود انٹر پرائزز سے 2012 میں شائع ہوکر منظر عام پر آ گئی ہے۔

۵۔ حج بیت اللہ کا مبارک سفرنامہ اور مکمل ارکان حج و عمرہ کتابچہ ''سوئے حرم'' اُردو اور ہندی میں شائع ہوئی۔

۶۔ اپنے وطن کی تاریخ اور خاندانی شجرہ بعنوان ''تاریخ الہری ہانس'' مرتب کر کے شائع کیا۔

۷۔ ماہنامہ ''ثافی'' لکھنؤ کی پانچ سال ادارت کی۔

......☆......

نام : مشکور احمد صدیقی

قلمی نام : احمد مشکور

پیدائش : 25/دسمبر 1937ء

آبائی وطن : موضع وڈاکخانہ ہری ہانس، ضلع سیوان (بہار)

ملازمت : شمالی مشرقی ریلوے گورکھپور کے زیر تحت دس سال لکھنؤ ڈویزن، دو سال مظفرپور (بہار) ڈسٹرکٹ اور گورکھپور بی۔جی۔ کنسٹرکشن میں خدمات انجام دے کر یکم جنوری 1996ء کو بحیثیت سیکشن انجینئر (ڈرائنگ) باعزت سبکدوش ہوئے۔

موجودہ مصروفیت:

اکلوتے بیٹے ڈاکٹر جمشید احمد صدیقی کے ساتھ ہم میاں بیوی دہلی کے خوبصورت اور شاندار فلیٹ میں مقیم ہیں۔ مدرسوں اور مسجدوں سے جڑا ہوا ہوں اور بقیہ وقت لکھنے لکھانے میں کٹ جاتا ہے۔ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھنا، تلاوتِ قرآنِ مجید سے بہتر کون سی مصروفیت ہوسکتی ہے۔
ریٹائرمنٹ کے بعد کئی افسانے اور مضامین تحریر کئے۔ لکھنے کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

ابتدائیہ

اپنے افسانوں کے مجموعہ کا عنوان ''بکھرے موتیوں کا ہار'' مقرر کرنے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ سن ۲۰۱۲ء تک جو کچھ بھی لکھا اور شائع ہوا اس کا بیشتر حصہ بکھرا پڑا رہا، ایک جگہ محفوظ رکھنے کا خیال نہیں آیا، جس کے نتیجہ میں اچھی تخلیق کا اچھا خاصہ حصہ غائب ہوگیا۔ ظفر پبلی کیشن الہ آباد سے ۱۹۶۰ء میں شائع ایک ناول، ماہنامہ ''شب خون'' الہ آباد میں شائع انشائیہ بعنوان ''افسانوں کی دُکان'' کے علاوہ افسانہ ''وثیقہ'' کی کوئی کاپی محفوظ نہیں ہے۔

۷۰ء کی دہائی میں، جب میں لکھنؤ میں پوسٹ تھا، ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ کے لئے سلسلہ وار مزاحیہ ڈرامہ ''میر صاحب'' تحریر کئے، جسے اس زمانہ کے پروگرام ایگزیکیٹو جناب پرکاش چند جوشی کی ہدایت میں ریکارڈ اور نشر کئے گئے۔ (واضح رہے کہ جوشی صاحب ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوکر اپنے آبائی پردیش اتراکھنڈ میں انتقال کر چکے ہیں) میرے ڈرامے ''میر صاحب'' کے سلسلہ میں ایک خاص بات قابل ذکر یہ ہے کہ میرا ہر ڈرامہ بمبئی آکاش وانی کے ''وودھ بھارتی'' پروگرام میں دوبارہ ان کے پروگرام ''آج اتوار ہے'' کے تحت ایک بج کر دس منٹ پر نشر کیا جاتا تھا، جس کی اطلاع میرے دوست احمد وصی، جو اس وقت آکاش وانی ممبئی سے منسلک تھے، بذریعہ ڈاک مجھے لکھنؤ دیتے تھے۔ ان ڈراموں کی خوبی یہ تھی کہ میر صاحب دراصل لکھنؤ کی روایتی تہذیب و تمدن کے جیتے جاگتے نمائندہ تھے، جن کا اندازِ گفتگو اور نشست و برخاست لکھنوی طرز پر ہوتا ہے۔ اس مشکل کردار کو آج کے ہندی ادب کے عظیم مزاح نگار پدم شری کے. پی. سکسینہ نے بڑی خوبی سے ادا کیا تھا۔ سکسینہ صاحب اس زمانہ میں ریلوے میں ملازم تھے اور لکھنؤ ریڈیو پر پروگرام کیا کرتے تھے۔

لکھنؤ سے گورکھپور تبادلہ ہونے کے بعد میں نے گورکھپور ریڈیو اسٹیشن کے لئے پروگرام ایگزیکٹیو ماتھر صاحب کی ایما پر بارہ ڈرامے تحریر کئے جو ان کی ہدایت میں نشر ہوئے۔ بارہ ڈراموں کی سیریز ''میر صاحب'' لکھنؤ سے اور بقیہ بارہ ڈرامے گورکھپور سے نشر ہوئے۔ مگر افسوس کہ ان چوبیس ڈراموں کی ایک بھی اسکرپٹ میرے پاس محفوظ نہیں ہے۔ میری ایک بُری عادت یہ تھی کہ میں ڈراموں کی اصل کاپی ہی جمع کر دیتا تھا، کبھی کاپی نہیں رکھی۔ ورنہ آج ۲۴ ریڈیائی ڈراموں کا ایک خوبصورت اور یادگار مجموعہ بہ آسانی منظر عام پر آسکتا تھا۔ اگر میں سنجیدگی سے افسانہ نگاری کی جانب ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرتا تو افسانوں کے کئی مجموعے وجود میں آچکے ہوتے۔

ادبی لحاظ سے میرے بہترین اوقات بچوں کے رسالہ ماہنامہ ''ٹافی'' لکھنؤ میں گذرے جس کی مدت تقریباً پانچ سال تھی۔ ٹافی کی ادارت میری ادبی زندگی کا سنہری دور تھا، جب میں نے ہندوستان کے عظیم شاعر اور ادباء سے بچوں کے لئے نظمیں اور کہانیاں لکھوا کر ٹافی میں شائع کیں۔ اس زمانہ میں بچوں کے لئے لکھنے والے مستقبل میں اُردو زبان وادب میں پی. ایچ. ڈی کر کے یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر کے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوئے۔ ''ٹافی'' میں مستقل حصہ لینے سے ان کے اندر تصنیف کا جذبہ پیدا ہوا اور اپنا مستقبل سنوارنے میں مدد حاصل ہوئی۔ ریڈیو اور دُوردَرشن میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ ایسے کئی حقیقت پسند افراد نے اپنی تصنیفات میں اس بات کا اعتراف کیا کہ ان کا ادبی سفر ماہنامہ ٹافی لکھنؤ سے احمد مشکور کی ہمت افزائی سے شروع ہوا۔ آج وہ دُوردَرشن میں باعزت عہدوں پر فائز ہیں۔ میرے لئے یہ فخر کی بات ہے۔

چند کو چھوڑ کر میرا ہر افسانہ کسی نہ کسی حقیقی واقعہ سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ چند کا ذکر میں نے وضاحت کے طور پر کیا ہے کہ آج سے پچاس سال قبل جس طرح فلموں کی ہیروئن کی کار سے دب کر نوجوان ہیروئن کی ہمدردی اور بعد میں محبت میں گرفتار ہو جاتا تھا، کچھ ایسا ہی ماحول کہانیوں کا بھی ہو گیا تھا جس کا حقیقت سے دُور دُور تک کوئی واسطہ نہ تھا۔ میں اپنے مجموعہ کے آخیر میں

دو افسانے جو پچاس سال قبل شائع ہو چکے ہیں ان کو جان بوجھ کر شامل کر رہا ہوں جس سے اُردو کہانیوں کے معیار کا علم ہو سکے۔ ماضی میں پہلی بیوی کے انتقال پر شوہر ''یادوں کے چراغ'' جلا کر حالِ دل سناتا تھا اور اب دوسری شادی کا اشتہار اخباروں میں چھپواتا ہے۔ بڑی پرانی کہاوت ہے کہ ہاتھ کی کہنی کی چوٹ اور بیوی کے انتقال کا غم شدید مگر وقتی ہوتا ہے۔ بیوی کے مرنے کے فوراً بعد اخبار میں اشتہار دیا جاتا ہے کہ دوسری بیوی کی حیثیت سے خوبصورت لڑکی کی تلاش ہے۔

ایسا ہی کچھ معاملہ میرے افسانہ ''ناک کا بال'' کا ہے۔ فلموں کے طرز پر پچاس سال قبل شائع شدہ افسانہ دراصل حقیقت سے دور ضرور ہے مگر دلچسپ ہے۔ غریب لڑکے کا امیر لڑکی کے والد کی کار سے دبنا اور پھر ان کی کوٹھی میں قیام کرنا اور سیٹھ کی لڑکی کے ساتھ ہوٹلوں میں تفریح کرنا خیالی پلاؤ پکانے جیسی بات ہے۔ اس افسانے کو پڑھ کر میرے ایک جرنلسٹ دوست نے کہا کہ اگر خوبصورت اور دولتمند لڑکی سے شادی کی امید ہو تو میں اس کے باپ کی کار کے نیچے آنے کے لئے تیار ہوں۔

زمانہ بدلا اور افسانوں کی تھیم بھی بدلی۔ اب سماج میں پھیلی برائیاں اپنے حقوق کی پہچان اور خدمت خلق کے جذبے پر کہانیاں لکھی جانے لگیں۔ اس مجموعہ میں شامل افسانہ ''جنازہ'' اور ''گمنام'' عبرت آموز ہی نہیں بلکہ ایک مومن کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں۔ آج کل شاعر حضرات ایک خاص موضوع پر خوب طبع آزمائی فرما رہے ہیں اور وہ ہے ''ماں'' میں نے اس موضوع پر ایک دل کو چھو لینے والی کہانی ''ثمرہ'' لکھی۔ ماں کی عظمت پر منحصر کہانی کو پڑھ کر آپ یقیناً متاثر ہوں گے۔ میں اپنی ہی لکھی اس کہانی کو پڑھ کر اکثر رویا ہوں۔ کیونکہ میری بھی ماں اب اس دُنیا میں نہیں ہیں۔ تعلقداری ختم ہونے کے بعد مصنوعی زندگی جینے کی خوبصورت داستان آپ افسانہ ''نجیب الطرفین'' میں پائیں گے۔ ہر افسانہ کا موضوع آج کے سماج میں رائج فرسودہ رسومات اور حالاتِ حاضرہ کی مظہر ہے۔ جائیداد میں لڑکیوں کا حق اللہ کی جانب سے ہے جس کی تفصیل سورۂ نساء میں بہت واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مگر لڑکیاں وراثت سے محروم

ہیں۔ اس نازک مسئلہ کو میں نے بہت ہی خوبصورت انداز میں کہانی ''وراثت'' میں پیش کیا ہے جس کے کلائمکس پر ہر صاحب علم وفہم کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ہندو مسلم ایکتا پر بہت لکھا جاتا ہے اور تقاریر بھی ہوتی ہیں۔ انسانی ہمدردی کو اس رشتہ کو میرے افسانہ ''رشتہ'' میں بہت واضح طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔ دل کو چھو لینے والی کہانی ہے۔

ایک ضروری اور اہم اَمر کی وضاحت کرنا اپنا فرض تصور کرتا ہوں کہ میں نے ابتدائی دور میں ''مشکور ہر ہانسوی'' کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ اس نام سے افسانے اور مضامین کے علاوہ میری جاسوسی ناول ''سونے کی لاش'' بھی شائع ہو چکی ہے جسے الہ آباد کے پبلشر جناب دینا ناتھ بھارگو نے اپنے اشاعتی ادارہ ''ظفر پبلی کیشن'' سے شائع کیا تھا۔ مشکور ہر ہانسوی سے احمد مشکور بننے کی داستان کچھ اس طرح ہے کہ ایک ملاقات میں جناب رام لعل، جناب شمس الرحمٰن فاروقی بیٹھے تھے، جب مشہور افسانہ نگار رام لعل صاحب نے مشورہ دیا کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ بتایا جائے کہ ہم کون ہیں۔ مثلاً میں ''رام لعل چھابڑہ'' ہوں، مگر صرف رام لعل لکھتا ہوں اور اسی نام سے لوگ جانتے ہیں اور پہچانتے ہیں۔ لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ آپ اب اپنا نام صرف احمد مشکور لکھیں۔ اسی دن سے میں احمد مشکور ہو گیا۔ افسانے بھی لکھے اور بچوں کے ماہنامہ ''ٹافی'' لکھنؤ کی پانچ سال ادارت بھی کی۔ میرے امریکہ کے سفرنامہ کے مشاہدات روزنامہ ''آگ'' لکھنؤ میں ۲۲ قسطوں میں بھی اسی نام سے شائع ہوئے۔

میں اپنے عزیز دوست سیّد ظفر ہاشمی ایڈیٹر دوماہی ''گلبن'' لکھنؤ کا بیحد مشکور ہوں، جنھوں نے اپنے ادارہ سے اپنی نگرانی میں میرے افسانوں کے مجموعہ ''بکھرے موتیوں کا ہار'' شائع کیا۔

قارئین سے گذارش ہے کہ وہ اپنی پسند/ ناپسند کی رائے دیں یا نہ دیں مگر میں ان سے گذارش کروں گا کہ وہ پورے مجموعہ کو شروع سے آخر تک ضرور پڑھیں۔

......☆......

عرضِ ناشر

یہ دوچار برس کی بات نہیں۔ نصف صدی سے اوپر کا قصہ ہے۔ میں گورکھپور یونیورسٹی میں ایم.کام سال اوّل کا طالب علم تھا اور غازی روضہ محلہ میں برادرم محترم سیّد بدرالحسن (مرحوم) کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ آر.ایم.ایس. میں ملازم تھے۔ انہیں دنوں پڑوس کے محلّے کھوکھر ٹولہ میں ''شمع ادب'' نام سے ایک ادبی انجمن فعال تھی جس کی ہفتہ وار نشستیں ہر اتوار کی پابندی کے ساتھ منعقد ہوتی تھیں۔ مجھے خبر ہوئی تو ایک دن میں بھی اُدھر جا نکلا۔ کھوکھر ٹولہ محلّہ میں جناب حمیدالظفر عثمانی (شوہر گورکھپوری) کے مکان کے باہری کمرے میں چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں میں ایک جاذب نظر بیس بائیس سال کا لڑکا بھی تھا جس کے خوبصورت چہرے پر پتلی کمانی کا چشمہ اس کی شخصیت میں چار چاند لگا رہا تھا۔ بڑا تیز طرار تھا۔ اپنے ہاؤ بھاؤ سے وہ اس محفل کا روح رواں لگ رہا تھا معلوم ہوا کہ وہ انجمن شمع ادب کے سکریٹری ہیں۔ ریلوے میں ملازم ہیں، افسانہ نگار ہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ میری آنکھوں میں کُھب گئے اور کچھ زیادہ اس لئے بھی کُھبے کہ میرا رجحان بھی افسانہ نگاری کی طرف تھا، گوکہ اس وقت تک میں نے افسانہ لکھنا شروع نہیں کیا تھا۔

وہ اس کتاب کے خالق احمد مشکور تھے اور زمانہ ۱۹۵۸ء کا تھا۔ اُن دنوں وہ مشکور ہرہانسوی ہوا کرتے تھے۔ انجمن شمع ادب کی تقریباً ہر نشست میں وہ اپنا تازہ افسانہ سناتے تھے۔ اُن کے تعلقات چندر سالوں سے تھے جن میں حسین امین کا ہفتہ وار ''دُنیا'' (لکھنؤ) اور محمود عالم کا ''فلم سنسار'' (بمبئی) خاص تھے۔ جن میں اُن کے افسانے اور چند دوسرے لوگوں کی شعری تخلیقات انہیں کے توسل سے شائع ہوتی تھیں۔ برادرم اشفاق ہاشمی جو سنٹرل بینک میں ملازم تھے، شمع ادب کے صدر تھے اور دھوم سے شاعری کرتے تھے اور دھڑلے سے چھپتے تھے۔ شوہر گورکھپوری ہزل گو تھے۔ محفل کو زعفران زار بنانے کا کام ان کا تھا۔ چند دوسرے لوگ بھی تھے جن میں اقبال احمد اقبال، جمال نندوری اور اشفاق حسین صدیقی کے نام ذہن میں محفوظ رہے۔ مشکور

ہرہانسوی سب کو ایک دھاگے میں پروئے رہتے۔ میرے اندر افسانہ نگاری کے جراثیم تو تھے ہی کب تک انہیں دبائے رکھتا۔ ایک دن ایک عدد افسانہ لے کر آتش نمرود میں کود پڑا۔ مشکور ہرہانسوی نے اسے ہفتہ وار ''دُنیا'' لکھنؤ میں شائع کرادیا۔ اس طرح میرا پہلا افسانہ ''نیلے گلابی لفافے'' (ظاہر ہے ۱۸ سال کا لڑکا اور کیا لکھتا) عالم وجود میں آیا اور میں اچھا بُرا افسانہ نگار بن گیا۔ دو سال تک انجمن شمع ادب کی محفلوں سے سرفراز اور فیضیاب ہوتا رہا، پھر ایم.کام کرنے کے بعد میں بمبئی چلا گیا اور وہاں سے احمد آباد، پھر وقت کے دھارے میں کچھ اس طرح ڈوبتا اور اُبھرتا رہا کہ دھیرے دھیرے گورکھپور، وہاں کے احباب، محفلیں، نشستیں سب ذہن سے مندمل ہوتے ہوتے غائب ہو گئیں۔

لیکن میں اپنی کہانی نہیں احمد مشکور کے بارے میں لکھ رہا ہوں، پھر پتہ نہ چلا کہ وہ دبلا پتلا تیز طرار لڑکا جس کے دم سے انجمن شمع ادب گورکھپور روشن تھی، کہاں گیا اور اس کی افسانہ نگاری کا کیا حال ہے۔ میں نے اپنے طویل ادبی اور صحافتی سفر میں اس کا نام پھر نہ سنا نہ اس کی کوئی تخلیق پڑھی۔ ایسا بھی نہیں کہ اس نے قلم رکھ دی تھی۔ وہ بہت کچھ کرتا رہا تھا جیسا کہ اس کتاب میں شامل اس کے ابتدائیہ سے ظاہر ہے۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ بمبئی اور احمد آباد میرا مرکز عمل ٹھہرا تھا اور وطن عزیز سے رابطہ بہت کم رہا تھا، اس لئے احمد مشکور کی ذاتی زندگی سے دُور اور اُن کی ادبی سرگرمیوں سے پوری بیالیس سال تک ناواقف رہا، پھر ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ۲۰۰۳ء میں لکھنؤ چلا آیا۔ انہیں دنوں میری لینڈ لائن پر ایک فون آیا۔ پوچھا کون؟ جواب ملا ''مشکور احمد صدیقی''......

''کون مشکور احمد صدیقی؟''...... میرے شناساؤں میں کوئی اِس نام کا نہ تھا۔ اس لئے وضاحت چاہی۔ اس پر جواب آیا۔ ''احمد مشکور''۔

یکایک میرے ذہن کے ایک گوشے سے وہ دُبلا پتلا لڑکا نکل پڑا جو شمع ادب کی محفلوں میں نمبر تین کی سگریٹ کی ایک ڈبیا منگانا نہ بھولتا تھا اور ہم لوگ جم کر دھواں اُڑاتے تھے۔ یہ دھواں اشفاق ہاشمی کو بہت ناگوار گزرتا اور وہ ہمیں کوسنے لگتے۔

''مشکور ہر ہانسوی''......میں نے استفسار کیا۔

''اب پہچانا''۔

اُدھر سے آواز آئی تو میری مسرت کی انتہا نہ رہی اور میں پچاس سال کا سفر اُلٹے پاؤں لمحوں میں طے کر گیا۔ پھر ایک دن لکھنؤ ہی میں ملاقات ہوگئی دو بوڑھوں کی۔

لیکن اب اس قصے کو ختم کرتا ہوں۔ صرف یہ لکھنا باقی ہے کہ جس افسانہ نگار نے پچاس سال قبل افسانہ نگاری کی ابتدا کی تھی اس کی زنبیل میں یہ ۱۸؍افسانے ہی کیوں؟ اس کے تو اب تک ۱۸؍مجموعے شائع ہو جانے چاہئے تھے۔ لیکن احمد مشکور کو کچھ دوسرے کام کرنے تھے۔ جسے انہوں نے پوری دیانت داری، لگن اور خلوص سے کیا۔ اس لئے انہیں پشیمان ہونے کی ضرورت نہیں، وہ اپنے طور پر فعال اور متحرک رہے اور اُردو زبان وادب پر پوری توجہ مرکوز کرتے رہے۔ بچوں کا رسالہ 'ٹافی' کے مدیر رہے، ایک جاسوسی ناول 'سونے کی لاش' لکھی، کچھ مزاحیہ اور متفرق چیزیں لکھیں۔ اپنے امریکہ کے سفر کی روداد قسط وار چھپوائی۔ ان کی کچھ دوسری گراں قدر تخلیقات بھی ہیں جن کا ذکر انہوں نے اپنے ابتدائیہ میں کیا ہے۔ وہ ۱۹۵۸ء سے انجمن ادب اطفال سے بحیثیت ادبی سکریٹری وابستہ ہیں جس کے موجودہ صدر سیّد سبط رضی (سابق گورنر جھارکھنڈ) ہیں۔ اس انجمن کے جنرل سکریٹری سعد الدین احمد عندلیب کا گذشتہ دنوں انتقال ہوگیا۔

یہ مجموعہ میں اپنے ادارہ گلبن سے اس لئے شائع کر رہا ہوں کہ احمد مشکور نے میری افسانہ نگاری کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ میرے اوّلین افسانے کی اشاعت انہیں کی مرہونِ منت ہے۔ اس لئے ان کے اس مجموعہ کی اشاعت کو میں باعث افتخار اور اپنی مشکوری کا اظہار یہ سمجھتا ہوں۔

اُمید ہے کہ اُن کے اس افسانوی مجموعہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

......☆......

سیّد ظفر ہاشمی
ایڈیٹر گلبن، لکھنؤ

جنازہ

قریب کی ایک مسجد میں نمازِ جمعہ کے لئے جب میں داخل ہوا تو وہاں ایک ضروری اعلان ہورہا تھا۔ ''بھائیو! ایک مسلمان پردیسی کا اسپتال میں انتقال ہوگیا ہے۔ ہمارے علاقہ کے نیتا جی عبدالحمید صاحب میّت کو دینی جذبہ کے تحت اسپتال سے اپنے گھر لے آئے ہیں۔ بعد نمازِ جمعہ تجہیز و تکفین ہوگی۔ آپ سب سے شرکت کی درخواست ہے''۔ ابھی مسجد میں اذان نہیں ہوئی تھی، نماز کی تیاریوں میں لوگ مشغول تھے۔ اعلان سن کر لوگوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور چند ایک نے کچھ سرگوشیاں بھی کیں۔ کسی نے کہا جنازہ میں شریک ہونا تو ویسے بھی فرض کفایہ ہے اور پھر یہ تو ایک پردیسی مسلمان کا معاملہ ہے اور سبھی نے اثبات میں سر ہلا دیئے۔

اس سیدھے سادے اعلان نے میرے اندر کے انسان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں سوچنے لگا کہ انسان کی حقیقت کیا ہے؟ کہاں پیدا ہوتا ہے اور کہاں سپردِ خاک کیا جاتا ہے۔ شاید یہ بات سوائے مالک کائنات کے کسی کے علم میں نہیں۔ دہلی میں قیام کی وجہ سے عبدالحمید نیتا جی سے میری سرسری سی ملاقات تھی جو اپنے علاقہ کے مقامی سماجی اور فلاحی کاموں کی وجہ سے قوم کے درمیان کافی مقبول ہوچکے تھے۔ عوام الناس کا خیال تھا کہ نیتا جی بلا کسی دنیاوی غرض کے خالص اللہ کی رضا کی خاطر خلوص کے ساتھ ہر فرد کی خدمت کرنا اپنا فرض اوّلین تصور کرتے ہیں۔

پردیسی مسلمان کے جنازہ میں کثیر مجمع نے شرکت کی۔ قبرستان سے باہر نکل کر میں نے نیتا جی سے مرحوم کی بابت دریافت کیا۔ انہوں نے جو تفصیل بتائی وہ میرے لئے حیرت میں ڈالنے کے لئے کافی تھی۔ مرحوم ذہین احمد لکھنؤ کے باشندہ تھے اور گذشتہ چھ ماہ سے دہلی کے ایک پانچ ستارہ اسپتال میں زیر علاج تھے۔ ان کے توسط سے معلوم ہوا کہ ذہین صاحب مرکزی

حکومت کے اعلیٰ عہدہ پر ملک کے مختلف صوبوں اور شہروں میں بحیثیت ڈائریکٹر خدمات انجام دے چکے تھے۔ میرے لئے حیرت کی بات یہ تھی کہ ذہین صاحب لکھنؤ میں کئی سالوں تک میرے پڑوسی کی حیثیت سے رہ چکے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے لکھنؤ سے دہلی ہجرت نہیں کیا تھا۔ لہٰذا میں ماضی کی تلخ وشیریں یادوں میں کھو گیا۔

''میں لکھنؤ میں پیدا ہوا۔ مولوی گنج کی تنگ اور گندی گلیوں میں کنچے کھیلے اور چھتوں پر کنکوے اُڑائے''۔ میں اپنے ہم سایہ ذہین احمد صاحب کو اپنے بارے میں بتا رہا تھا جنہوں نے میرے پڑوس میں ایک عالیشان کوٹھی نما مکان تعمیر کرایا تھا۔ میں نے گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا:

''میں ان حسین لمحوں کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا جب ہم امین آباد کی شام کا لطف اٹھانے کے لئے عبداللہ کیفے کے سامنے اکٹھا ہوا کرتے تھے''۔

''مگر جناب! اب تو شام کو امین آباد میں کسی ایک جگہ چند لمحے کھڑا ہونا مشکل ہے''۔ ذہین صاحب نے کہا۔

''میں اس زمانہ کی بات کر رہا ہوں جب لکھنؤ کی شام اور صبح بنارس کے ساری دُنیا میں چرچے ہوا کرتے تھے۔ ذہین صاحب آپ یقین کریں کہ گرمیوں کی شام کا لطف اٹھانے کے لئے امین آباد چوراہے پر ادیب، شاعر اور سیاست داں اکٹھا ہوتے تھے اور کھڑے کھڑے مختلف موضوعات پر سیر حاصل گفتگو ہوتی تھی''۔

''مگر آج کا ماحول ہی بدلا ہوا ہے''۔ انہوں نے کہا ''گفتگو تو درکنار، رُک کر کسی کی خیریت دریافت کرنا بھی مشکل ہے''۔

''بجا فرمایا آپ نے۔ میں اس لکھنؤ کی بات کر رہا ہوں جب امین آباد کی شام سے لطف اندوز ہونے کے لئے فرنگی محل کے ایک بزرگ عالم دین اپنے داہنے ہاتھ میں کھلا ہوا چھاتا لئے تشریف لاتے تھے''۔ میں نے کہا۔

''چھاتا۔ اور وہ بھی شام کے وقت؟ میں سمجھا نہیں''۔ ذہین صاحب نے تجسس سے دریافت کیا۔

''جی ہاں۔ ذہین صاحب۔ آپ لکھنؤ والوں کی نزاکت سے واقف نہیں۔ قدیم زمانہ کے ان حضرات کی اگر قیصر باغ سبزی منڈی سے گزرتے وقت کیلوں پر صرف نظر پڑ جاتی تھی تو ان کو زکام ہو جایا کرتا تھا۔ اور جناب خدانخواستہ اگر مولی کے پتوں پر جوتے پڑ جائیں تو نزلہ ہونے کا خطرہ لاحق رہتا تھا''۔ میں نے کہا۔

ذہین صاحب ہنسنے لگے۔ اس کی وجہ صاف تھی کہ انہوں نے وہ لکھنؤ دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ ایسے زمانہ میں ریٹائر ہو کر لکھنؤ میں قیام پذیر ہوئے تھے جب یہ خوبصورت شہر اپنی ساری خوبصورتی اور رعنائیوں کو کھو چکا تھا۔ چھوٹے چھوٹے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں سے لوگ لکھنؤ آ کر نو تعمیر شدہ کالونیوں میں آباد ہو رہے تھے۔ جس میں بیشتر حضرات کا شین قاف تک درست نہیں تھا۔

بات چھاتے کی ہو رہی تھی۔ ذہین صاحب نے یاد دلایا ''جسے فرنگی محل کے وہ بزرگ لے کر شام کو امین آباد آیا کرتے تھے''۔

''جی ہاں''۔ میں نے کہا ''آپ نے بجا فرمایا۔ دراصل لکھنؤ کی شام اپنی سہانی اور خوشگوار ہواؤں کی وجہ سے مشہور تھی۔ مولانا فرنگی محلی شبنم سے بچنے کے لئے کھلا چھاتا لے کر چلتے تھے، ورنہ زکام ہونے کا خدشہ لگا رہتا تھا۔ اب نہ تو وہ لوگ رہ گئے اور نہ وہ لکھنؤ۔ جس کی شان میں شاعروں نے لمبے چوڑے قصیدے لکھے ہیں۔

''پھر آپ لکھنؤ سے دہلی کیوں ہجرت کرنا چاہتے ہیں؟ انہوں نے دریافت کیا۔

''کون کمبخت خوشی سے لکھنؤ چھوڑنا چاہتا ہے''۔ میں نے برجستہ جواب دیا۔

''پھر آپ کیوں جانا چاہتے ہیں؟ آپ کے جانے سے میں ایک اچھے پڑوسی سے محروم ہو جاؤں گا''۔ ذہین صاحب نے اپنے دلی جذبے کا اظہار کیا۔

''ذہین صاحب! لکھنؤ سے میرا جذباتی تعلق ہے۔ اب آپ غور فرمائیں کہ لکھنؤ کے عیش باغ قبرستان میں میرے دو معصوم بچے قبر کی گود میں آرام کررہے ہیں اور میرے محترم دوست اسی قبرستان کے سب سے محفوظ مقام ''چمن'' میں میری عزیز والدہ ماجدہ آرام فرما رہی ہیں۔ ایسے لکھنؤ سے ہجرت کرنا کیا آسان بات ہے''۔ میں نے جواب دیا۔

''معاف کیجئے گا منظور صاحب! مجھے اس سانحہ کا علم نہ تھا۔ سن کر افسوس ہوا''۔

''ذہین صاحب۔ یقین کریں لکھنؤ سے میرا جذباتی تعلق اس لئے بھی ہے کہ یہ میری جائے پیدائش ہی نہیں بلکہ یہ سرزمین میرے صبر اور آزمائشوں کی امتحان گاہ بھی ہے''۔

میں تھوڑا جذباتی ہو گیا اور مردہ آواز میں بولا۔

''میں دنیا کا وہ بدنصیب باپ ہوں جس کے کندھوں نے دو بیٹوں کا جنازہ اٹھایا ہے۔ میں نے بھاری دل سے ذہین صاحب کو اپنی داستانِ غم سنائی تو میرے ساتھ وہ بھی آبدیدہ ہو گئے۔ محض دو مہینوں میں دو معصوم بچوں کو سپرد خاک کرنا معمولی بات نہیں ہے۔ سوچتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ پھر یہ سوچ کر صبر کرتا ہوں کہ میرے یہی دونوں معصوم بیٹے میری بخشائش کا ذریعہ بنیں گے''۔

''مجھے بیحد افسوس ہے منظور صاحب'' ذہین صاحب بھی مغموم ہو گئے۔

پڑوسی کی حیثیت سے ذہین صاحب سے میرے بیحد خوشگوار تعلقات تھے۔ وہ تعلیم یافتہ اور مہذب انسان تھے۔ سردیوں کی ایک صبح جب ہم دونوں کے لان میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی، ہم آرام سے کرسیاں ڈالے محو گفتگو تھے۔ اس وقت گفتگو کا موضوع لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کرنے اور لکھنؤ سے ہجرت کرنے کا زیر بحث تھا۔ ان کا نظریہ بہت واضح تھا کہ مستقل سکونت ایسے مقام پر اختیار کرنی چاہئے جہاں آپ کے چند دوست، ہمدرد اور رشتہ دار ہوں جو آپ کے اچھے بُرے وقت میں آپ کے ساتھ کھڑے ہو سکیں۔

''میں آپ کے اس نظریے سے کلی طور پر متفق ہوں''۔

میں نے کہا۔ ''مگر کبھی کبھی حالات مجبور کرتے ہیں تو انسان اصولوں سے ہٹ کر چلنے پر مجبور ہو جاتا ہے''۔

''نہیں صاحب۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ ذہین صاحب نے تھوڑی ناگواری کے لہجے میں فرمایا'' حالات کیا چیز ہیں؟ حالات انسان خود بناتا اور بگاڑتا ہے۔ آپ اپنی عقل سلیم کا صحیح استعمال کریں اور بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔ آپ کو کسی طرح کی پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا''۔

''بجا فرمایا آپ نے'' میں نے جواب دیا اور سوچنے لگا کہ ذہین صاحب کے اندر ایک اور انسان ہے جس کی زبان میں وہ گفتگو کر رہے ہیں اور وہ انسان ہے ان کی انا یا میں۔ جو اللہ تبارک وتعالیٰ کو بے حد ناپسند ہے۔

''میری باتوں کو سمجھنے کی کوشش کیجئے''۔ انہوں نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''میں چاہتا تو ہندوستان کے کسی بھی بڑے شہر میں مکان بنوا سکتا تھا، بلکہ ہندوستان سے باہر انگلینڈ، امریکہ اور آسٹریلیا میں آباد ہو سکتا تھا، مگر میں نے لکھنؤ کو اس لئے ترجیح دی کہ لکھنؤ میں میرے کچھ دوست اور چند سگے عزیز رہتے ہیں۔ زندگی کے آخری دنوں میں اپنوں کی ضرورت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ دیارِ غیر میں کون کسی کو پوچھتا ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ ہم دونوں خاموش ہو گئے اور غمگین بھی۔ ذہین صاحب نے اس خاموشی کے پردے کو چاک کیا اور بولے۔

''تو آپ نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ لکھنؤ سے ہجرت کر کے دہلی کو اپنا مستقل مسکن بنائیں گے''۔

''جی ہاں۔ شاید اللہ کی یہی مرضی ہے۔ میرے اکلوتے بیٹے کا اصرار ہے کہ آپ مستقل ہمارے ساتھ دہلی آ کر رہیں''۔ میں نے ان کو جواب دیا۔

''دہلی میں آپ کے کچھ عزیز رشتہ دار وغیرہ ہیں''۔ انہوں نے دریافت کیا۔

''نہیں جناب۔ دہلی میرے لئے اجنبی شہر ہے''۔ میں نے جواب دیا۔

''دہلی سے میرا دُور دُور تک کوئی واسطہ نہیں ہے''۔

''تب پھر''۔

ذہین صاحب نے مجھے جو مشورہ دیا اسے ہر مومن کو ذہن نشین کر لینے کی ضرورت ہے۔

''تب پھر دہلی میں آپ اپنا جنازہ اٹھوانے کے لئے کرائے کے چار افراد کا انتظام کر لیجئے گا جو آپ کو قبرستان تک پہنچا سکیں''۔

ایک وہ اور آج کا دن، ذہین صاحب کے جنازہ سے فرصت پا کر میں سوچ رہا ہوں کہ میں بھی کتنا لاپرواہ اور کاہل ہوں۔ ابھی تک میں اپنے جنازہ کو کندھا دینے والے چار آدمیوں کا انتظام نہیں کر سکا جو میرے جنازہ کو کندھا دے کر قبرستان تک پہنچا سکیں۔

اتنے میں قریب کی کسی مسجد سے اذان کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اور میں مسجد کی طرف چل پڑا۔

......☆......

(بزمِ ادب ''سہارا'' دہلی۔ مئی ۲۰۰۷ء)

گمنام

گورکھپور اعظم گڑھ شاہراہ پر رات ودن موٹر گاڑیوں اور بسوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سڑک مشرقی اتر پردیش کے دو مشہور، ترقی یافتہ، مہذب اور قدیم شہروں کو زمینی سفر کے ذریعہ ایک دوسرے سے ملاتی ہے۔ گورکھپور شہر اپنے قدیم دور کی یادگار امامباڑہ، گورکھ ناتھ مندر کے علاوہ اُردو کے عظیم ترین شاعر حضرت فراقؔ گورکھپوری اور مشہور نقاد حضرت مجنوںؔ گورکھپوری کی ذات عالمی شہرت کا حامل ہے اور شہر اعظم گڑھ دار المصنّفین اور حضرت مولانا شبلیؒ کی عالمی شہرت یافتہ تصنیف ''سیرت النبیؐ'' کے علاوہ نامور شاعر جناب کیفی اعظمی اور ان کی صاحبزادی اداکارہ شبانہ اعظمی کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور و معروف ہے۔

اسی شاہراہ پر ایک قصبہ بڑہل گنج ہے، جہاں صبح آٹھ بجے مسافروں سے بھری ایک جیپ مخالف سمت سے آ رہی ایک تیز رفتار مسافر بس سے ٹکرائی اور جیپ میں سوار ڈرائیور کے علاوہ ایک مولانا صاحب کی موقع ہی پر موت ہوگئی۔ اس زبردست حادثے کی خبر پر چشم زدن میں سیکڑوں افراد جمع ہوگئے۔ ہر ایک کا چہرہ افسوس زدہ اور مغموم تھا۔ سبھی اس حادثے سے غمگین نظر آ رہے تھے۔ ہر ایک کی زبان پر اس ہولناک حادثے کا ذکر تھا۔ سبھی اپنے اپنے نظریے سے تبصرہ کر رہے تھے کہ غلطی کس کی تھی۔ کچھ لوگ اس بات پر زور دے رہے تھے کہ جیپ والے تھوڑے سے پیسوں کی لالچ میں گنجائش سے زیادہ سواریاں بٹھا لیتے ہیں اور گاڑی سنبھال نہیں پاتے۔ لہٰذا روزانہ کوئی نہ کوئی حادثہ ہوتا ہے۔ ایک صاحب نے کہا۔

''نہیں صاحب! میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ یہ بس والے آنکھ بند کر کے بس چلاتے ہیں، جس کی وجہ سے یہ حادثے ہوتے ہیں''۔ دوسرے نے جواب دیا۔

مجمع میں کھڑے ایک شخص نے اپنی بغل میں کھڑے ساتھی سے دبی زبان میں کہا۔

"لگتا ہے کہ اس سڑک پر ان صاحب کی بھی کوئی جیپ چلتی ہے"۔

یہ حادثہ بڑہل گنج میں ہوا تھا اور بڑہل گنج میں لب سڑک ڈاکٹر ایوب انصاری کا نرسنگ ہوم واقع ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک سرجن ہیں اور اپینڈی سائٹس یعنی زائد آنتوں کے آپریشن کے ماہر ہیں۔ کم سے کم وقت میں اور ماہ میں زیادہ سے زیادہ آپریشن کر کے ڈاکٹر صاحب گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اپنا نام درج کروا چکے ہیں۔ اس علاقے میں ان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند، غریبوں کے ہمدرد اور اپنی انسانیت دوستی کی وجہ سے قرب وجوار کے مسلم وغیر مسلم عوام میں بیحد مقبول ہو چکے ہیں۔ لہٰذا نرسنگ ہوم میں داخل مریض اور سیکڑوں کی تعداد میں مریضوں کے تیماردار جیپ کے اس حادثے کی خبر سن کر کہ ایک مولانا صاحب کا انتقال ہو گیا ہے، موقعۂ حادثہ پر اکٹھا ہو گئے۔

"مولانا صاحب کسی بڑے گھر کے معلوم ہوتے ہیں"۔ ایک دیہاتی مریض نے کہا۔

"یقیناً۔ ان کی قیمتی نئی شیروانی، ٹوپی اور چمکتے ہوئے نئے جوتوں سے اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ مرحوم کا تعلق کسی رئیس خاندان سے ہے"۔ کسی باحیثیت مریض کے تیماردار نے مولانا صاحب کو بغور دیکھنے کے بعد تبصرہ کیا۔

"بیچارے۔ پتہ نہیں کہاں جا رہے تھے"۔ کسی نے کہا۔

"کوئی ان مولانا صاحب کو پہچانتا ہے......؟" ایک پولیس والے کی آواز گونجی۔

"نہیں صاحب"...... بیک وقت کئی آوازیں آئیں۔

"غور سے دیکھو......" پولیس والے نے کرخت آواز میں ایک داڑھی والے سے مخاطب ہو کر کہا "تمہاری ہی برادری کے کوئی بہت بڑے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

بڑہل گنج کی پولیس اور وہاں کی عوام کی لاکھ کوششوں کے باوجود مولانا صاحب کی شناخت نہیں ہو سکی۔ اب یہ بات طے ہو چکی تھی کہ مولانا صاحب اس علاقے کے لئے اجنبی ہیں

مگر ہر شخص اس بات کا معترف تھا کہ ایسی نورانی شکل وصورت والی شخصیت کا تعلق یقیناً کسی بہت بڑے اور رئیس خاندان سے ہے۔ جیپ کی نمبر پلیٹ سے یہ تو پتہ چل گیا کہ گاڑی گورکھپور شہر کے سیٹھ اوم پرکاش کی ہے۔جس کا ڈرائیور محمد اقبال نامی نوجوان تھا جو اس حادثہ کا شکار ہو گیا۔ حادثے کے سلسلے میں قانونی کارروائی کے تحت پولیس نے مولانا صاحب کی لاش کو گھپور کوتوالی بھیج دیا۔

گورکھپور کی پولیس کوتوالی امام باڑہ اور انجمن اسلامیہ کے درمیان واقع ہے۔کوتوالی نے مولانا صاحب کی لاوارث لاش کو قانوناً انجمن اسلامیہ کو تجہیز و تکفین کے لئے حوالے کر دیا۔ لاوارث لاشوں کی تجہیز و تکفین انجمن اسلامیہ کی ذمہ داریوں میں شامل تھی۔اس نیک کام کے لئے عبدالمجید نامی ایک خادم مقرر تھا جس کو انجمن سے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ عبدالمجید کثیر الاولاد ہونے کے علاوہ بے حد غریب تھا، لہٰذا انجمن اسلامیہ کے قریب واقع ''آشیانہ'' بلڈنگ سے اس کو روزانہ رات کا کھانا ملتا تھا۔ ''آشیانہ'' شہر کے ایک متمول باشندے اور ریٹائرڈ انکم ٹیکس کمشنر شکیل احمد کی کوٹھی تھی۔ گورکن عبدالمجید نے اس لاوارث کی تجہیز و تکفین کے لئے ''آشیانہ'' میں کچھ مالی امداد کی درخواست کی جو کسی ذمہ دار شخص کی غیر موجودگی کی وجہ سے نہیں مل سکی۔ عشاء کی نماز کے بعد مولانا صاحب کی لاوارث لاش کو خادم عبدالمجید نے قبرستان ''مبارک خاں شہید'' میں واقع غسل خانے میں موم بتی کی مدھم روشنی میں غسل دیا۔ کفن پہنایا اور چند لوگوں کی موجودگی میں، جس میں قبرستان کے دیگر ملازمین بھی شامل تھے، دفن کر دیا۔

عبدالمجید کے لئے یہ کوئی نئی اور عجوبہ بات نہیں تھی۔ یہ ذمہ داری وہ اکثر بخوشی نبھاتا تھا۔

گورکھپور کلب میں بیلیرڈ کھیلتے وقت کفیل احمد کو اچانک خیال آیا کہ ڈیڈی شادی میں شرکت کرنے گئے ہیں اور ابھی تک واپس نہیں آئے۔ لہٰذا انہوں نے فون سے رابطہ قائم کیا اور جب ان کو اس بات کا علم ہوا کہ ان کے ڈیڈی شکیل احمد نے شادی میں شرکت ہی نہیں کی۔ تو ان کے بیٹے کفیل کے پیروں سے زمین نکل گئی۔ وہ خود انہیں اعظم گڑھ جانے والی جیپ پر بیٹھا کر

آئے تھے۔ ان کی تو خواہش تھی کہ وہ خود ڈیڈی کو اپنی گاڑی سے اعظم گڑھ چھوڑ آئیں۔ مگر اس کے لئے شکیل صاحب راضی نہیں ہوئے تھے۔

اعظم گڑھ جاتے وقت جگہ جگہ معلومات حاصل کرتے ہوئے کفیل بڑہل گنج پہنچے اور وہاں کی پولیس چوکی کے مطابق ان کے والد کا جیپ اور بس کی ٹکر میں انتقال ہو چکا تھا۔ اس روح فرسا خبر کو سن کر وہ پولیس اسٹیشن پر ہی بے ہوش ہو گئے...... پولیس کے ذمہ داران میں سے ایک پولیس افسر نے کہا......

''مجھے افسوس ہے کہ آپ کے پتا نہیں رہے۔ ہم نے اپنے طور پر ان کی شناخت کی بہت کوشش کی مگر ہم کامیاب نہیں ہوئے۔ مجبوراً ہمیں ان کی لاش کو لاوارث لاش کی حیثیت سے گورکھپور بھیجنا پڑا''۔ تھانہ انچارج نے کفیل احمد کو دِلاسا دیا۔

''خدا کو یہی منظور تھا۔ آپ نے پھر بھی بہت کوشش کی''۔ کفیل نے جواب دیا اور بھاری دل سے اپنے ڈیڈی کی یادگار چند کپڑے اور بیگ لے کر لوٹ آئے۔ آشیانہ میں جیسے قیامت آ گئی۔ رونے اور چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پورا شہر اس اندوہناک خبر پر اکٹھا ہو گیا۔ ہر شخص کفیل احمد کو دلاسہ دے رہا تھا۔ ایک صاحب نے کہا۔

''تعجب ہے کہ عبدالمجید جو آشیانہ کا نوکر ہے قبرستان میں غسل دیتے وقت شکیل صاحب کو پہچان نہیں سکا''۔ کفیل نے ان کو جواب دیا۔

''اس کی غلطی نہیں ہے۔ ڈیڈی ابھی حال ہی میں حج کر کے لوٹے تھے۔ سوٹ اور ٹائی کی جگہ لمبی داڑھی اور شیروانی ٹوپی نے لے لی تھی۔ لہٰذا جس نے حج کے بعد ان کو نہیں دیکھا تھا پہچان نہیں سکتا تھا''۔

''اوہ...... یہ بات ہے''۔ کئی لوگوں نے ایک ساتھ کہا...... ''مگر افسوس کی بات ہے کہ شہر کا ایک رئیس لاوارث کی حیثیت سے دفن ہو گیا...... ''خدا کو یہی منظور تھا''۔ کفیل نے بھاری دل سے جواب دیا۔

مجھے بذاتِ خود تشویش تھی کہ ایسا کیوں ہوا۔ لہٰذا میں شکیل صاحب کے حج کے ساتھی حاجی رازق سے ملا اور اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو حاجی رازق صاحب نے فرمایا......

''جناب مشکور صاحب! اللہ تبارک وتعالیٰ نے شکیل کو ان کے حج کو قبول فرمالیا''۔

میں نے دریافت کیا، وہ کیسے؟

کہنے لگے۔

''پورے حج میں، قیام کے دوران رو رو کر گڑ گڑا کر ایک ہی دعا مانگتے تھے کہ اے اللہ میرا معاملہ ایک گمنام کی حیثیت سے کرنا، اگر تو نے شکیل انکم ٹیکس کمشنر کی حیثیت سے کیا تو میں بچ نہیں سکتا''۔

......☆......

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' گورکھپور۔ ۷/جون ۲۰۰۴ء اور
پندرہ روزہ ''گوشوارہ'' رڑکی۔ ۱۶تا۳۰/ستمبر ۲۰۰۷ء)

وراثت

مقبول احمد نے اپنی بڑی بہن سے وعدہ تو کر لیا تھا کہ وہ بھائی جان سے وراثت میں حصہ داری پر گفتگو کرے گا مگر اسے اس بات کا بخوبی علم تھا کہ موجودہ معاشرہ میں عورتوں کے تعلق سے وراثت کی تقسیم میں بہت سی خامیاں ہیں۔ اصلاح معاشرہ کے دوران اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ عورتوں کو وراثت سے محروم کرنے کی روایت زور پکڑ رہی ہے۔ زمینداری کے زمانہ کی جہاں بہت سی بدعتیں رائج تھیں، وہیں وراثت میں حق دختری کی ادائیگی کو ایک بہت بڑا عیب تصور کیا جاتا تھا۔ اس کی صرف ایک ہی وجہ تھی اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت۔ لہٰذا شرفاء نے ایک خودساختہ قانون نافذ کر دیا تھا کہ شریف گھرانے کی لڑکیاں اپنے حق دختری کا مطالبہ نہیں کرتیں۔ بے زبان لڑکیاں اپنے بزرگوں کی ہر خواہش کا احترام کرنا اپنا فرض سمجھتی تھیں، لہٰذا کسی کو زبان کھولنے کی ہمت نہ تھی۔ شادی کے بعد لڑکیاں اس بات پر ہی مطمئن تھیں کہ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں بچوں کو لے کر میکہ منالیتی تھیں۔ بچے آم کے باغات سے خوب سیر ہو کر آموں سے لطف اندوز ہوتے، بچیاں باغات میں جھولے ڈال کر خوب جھولا جھولتیں اور خوشی کے گیت گاتیں۔ گاؤں کی آب وہوا میں کچھ وقت گذار کر ماضی کو یاد کر کے ان کو جو خوشی حاصل ہوتی تھی وہ ناقابل بیان تھی۔

"تمہارے دولہا بھائی اپنے ریٹائرمینٹ سے قبل ایک گھر بنانا چاہتے ہیں" فہمیدہ بیگم نے اپنے چھوٹے بھائی مقبول احمد سے ایک دن کہا تھا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے"

"ہاں! اگر بھائی جان رقم مہیا کر دیں تو یہ کام بیحد آسان ہو جائے گا" فہمیدہ بیگم نے

کہا۔

''کیا حبیب بھائی نے آپ سے ایسا کہا ہے؟'' مقبول احمد نے دریافت کیا۔

''نہیں۔ انہوں نے تو نہیں کہا مگر ایک دن مکان بنانے کی اپنی خواہش کا اظہار ضرور کر رہے تھے''۔

''مگر باجی۔ یہ بات تو آپ کو بجائے مجھ سے کہنے کے، بھائی جان سے کہنی چاہئے تھی'' مقبول احمد نے اپنی بہن فہمیدہ کو سمجھایا۔

''دیکھو مقبول!۔ بھائی جان سے کہنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔''

''کیوں؟'' مقبول احمد نے پوچھا۔

''کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ وہ انکار کر دیں گے''

''کیوں۔ انکار کیوں کر دیں گے۔ یہ موروثی جائداد ہے اس میں شریعت نے آپ کا حق مقرر کیا ہے'' مقبول احمد نے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر میں نے ایک دن ان کو یہ کہتے سنا تھا کہ لڑکیاں وراثت میں اگر اپنا حق لے لیں تو پھر ان کو میکہ میں آنے کی ضرورت نہیں ہے'' فہمیدہ بیگم نے کہا ''واہ۔ یہ کیا بات ہوئی۔'' مقبول احمد نے کہا۔ ''اور لڑکے اس جائداد سے زندگی بھر فائدہ اٹھائیں اور مرنے کے بعد اپنی اولادوں کے لیے چھوڑ جائیں اس لیے کہ وہ لڑکے ہیں'' ''شاید یہی بات ہے۔'' بہن نے کہا۔ ''مقبول۔ جیتے جی مائکہ چھوڑنا لڑکی کے لیے آسان نہیں ہوتا ہے۔ لڑکیاں اپنے مائکے کی یاد میں کھوئی گرمی کی چھٹیوں کا بے صبری سے انتظار کرتی ہیں کب وہ آم کے موسم میں بچوں کو لے کر جائیں گی اور ابو، امی بھائی اور بھابھی کے ساتھ پوری چھٹیاں گذاریں گی۔ گاؤں میں شہر کی طرح نہ لائٹ جانے کا خدشہ ہوتا ہے اور نہ سڑک پر چلنے پر حادثہ کا خطرہ۔''

''مگر آپ یہ سب کیوں بیان کر رہی ہیں۔ آپ کو مائکہ جانے سے کون روک رہا ہے'' مقبول نے کہا ''بھیا مقبول۔ مجھے خدشہ ہے کہ کہیں وراثت کی آگ میرے مائکے کو جلا کر

راکھ نہ کردے۔''نہیں نہیں آپ ایسا کیسے سوچ سکتی ہیں۔ یہ ناممکن ہے''

''تمہیں احساس نہیں ہے کیونکہ تم لڑکے ہو۔ مائکے کی یاد کو لڑکیاں زندگی کی آخری سانسوں تک سینے سے لگائے رہتی ہیں۔ اپنی جائے پیدائش سے ذہنی اور قلبی لگاؤ ہوتا ہے مقبول۔ وہاں کے گھر، مٹی کی سڑکوں اور گلیوں کی خوشبوان کے وجود میں ایسی رچی بسی ہوتی ہے کہ اس کو اپنی شخصیت سے جدا نہیں کر پاتیں۔''

''باجی۔ آپ تو بہت جذباتی ہو گئیں۔''مقبول نے کہا۔

''تمہیں کیا معلوم کہ جب کوئی ان سے ان خوشنما ماحول کا ذکر کرتا ہے تو وہ دل میں ایک ہوک سی محسوس کرتی ہیں۔ کسی بھی خوشی یا غمی کے موقع پر لڑکیاں اڑ کر اپنے مائکے پہنچ جانا چاہتی ہیں۔''

''اس میں کیا شک ہے۔ باجی میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں مقبول احمد نے کہا۔''بھیا مقبول۔ مائکے کی کشش ان کے وجود کا ایک حصہ بن جاتی ہے جس کو بھلانا کسی بھی لڑکی کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔''فہمیدہ بیگم اتنا کہہ کر خاموش ہوگئیں۔''باجی آپ فکر نہ کریں۔ میں جانتا ہوں کہ بھائی جان ان باتوں کو نہیں سمجھیں گے مگر میں کسی مناسب موقع پر ان سے بات کروں گا۔''مقبول احمد نے کہا۔

مگر جب وہ مناسب موقع آیا اور مقبول نے اپنے بڑے بھائی محبوب احمد سے اپنی بڑی بہن فہمیدہ باجی کی خواہش کا ذکر کیا تو جیسے پوری کوٹھی میں طوفان سا آ گیا۔ محبوب میاں کے پیروں سے جیسے زمین کھسک گئی۔ ان کو اپنی سماعت پر یقین نہیں ہو رہا تھا کہ کیا مقبول نے جو بات کہی ہے وہ حقیقت ہے؟ اس نے اس طرح کہا تھا۔

''بھائی جان۔ فہمیدہ باجی کو وراثت میں اپنا حق چاہیے''۔

''کیا کہا۔؟''محبوب میاں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ شریف خاندان کی کوئی لڑکی براہ راست اپنے حق کا دعویٰ پیش کرے گی۔ ان کی نظر میں یہ سب قیامت کی نشانیاں

تھیں جو ظاہر ہو رہی تھیں۔

''مقبول۔ تم سمجھ رہے ہو کہ تم نے کتنی بڑی بات کہی ہے'' انہوں نے پوچھا۔ ''جی ہاں۔ میں سمجھ رہا ہوں۔ مجھے اس بات کا علم ہے کہ باجی کے حوالہ سے جو بات کہی گئی ہے اس کا ردعمل کیا ہوگا'' مقبول نے کہا۔

''پھر تم نے یہ بات کیوں کہی؟'' محبوب احمد نے پوچھا۔

''میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایسا کرنے میں قباحت کیا ہے؟''

''قباحت کیا ہے؟ بھائی جان نے غصہ میں جملہ کو دہرایا اور کہا۔ ''تم ایک قدیم روایت کو توڑ رہے ہو''

''کیسی روایت؟'' مقبول نے پوچھا۔

''پشتوں سے یہ خاندانی روایت چلی آ رہی ہے کہ لڑکیاں اپنے حق کے لیے کبھی زبان نہیں کھولتیں'' ''یہ تو اچھی بات نہیں ہے''۔

''ہے۔ وراثت میں اپنا حصہ لینے کے بعد وہ بقیہ تمام حقوق سے محروم ہو جاتی ہیں''

''مگر یہ ایک خود ساختہ قانون ہے ایسا کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ جس کی رو سے حق دختری لینے کے بعد لڑکی مائیکے کی سہولتوں سے محروم ہو جائے گی۔'' مقبول احمد نے کہا۔

''مقبول۔'' محبوب احمد نے اپنے چھوٹے بھائی کو ڈانٹا ''میں آپ سے امید کرتا ہوں کہ آپ جتنے ہیں اتنے ہی نظر آئیں تو بہتر ہے'' ''مجھے افسوس ہے'' کہہ کر مقبول کمرے سے باہر چلے گئے۔

فہمیدہ بیگم کا وراثت میں حصہ کی خواہش کا اظہار کرتے ہی جیسے طوفان آ گیا۔ زمیندارانہ ذہنیت نے اسے قبول کرنے سے اس لیے انکار کر دیا کہ دیگر خاندانوں کے لیے یہ عمل ایک نظیر بن جائے گا اور پھر ہر خاندان میں اس مطالبہ کی گونج سنائی دینے لگے گی جو بہت ہی خراب بات ہوگی۔ محبوب میاں نے اپنے بھائی مقبول سے بہت صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ یہ ناممکن

ہے۔

''مگر کیوں؟'' کیوں ناممکن ہے''مقبول نے ڈرتے ڈرتے اپنے بھائی سے سوال کرلیا۔''اس لیے کہ جو روایت کبھی نہیں رہی اس کو ہم کیوں قائم کریں۔ مجھے اپنی سسرال سے بیس لاکھ کی جائداد مل سکتی تھی جو آج بیس کروڑ کی ہوتی مگر میں نے نہیں لیا۔ محبوب نے کہا''مگر کیوں نہیں لیا۔ آپ کو کس نے روکا تھا''مقبول نے پوچھا۔

''کسی نے نہیں روکا تھا۔ مگر شرفاء میں اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا''

''اچھا۔ مقبول نے لفظ اچھا کو ذرا کھینچ کر کہا''دوسروں کا حق دبالینا کیا شرفاء میں اچھی نظر سے دیکھا جاتا ہے؟''

''مقبول۔''محبوب نے پھر ڈانٹا اور مقبول میاں پھر چپکے سے کھسک لیے۔

فہمیدہ بیگم کے شوہر حسیب احمد کی شخصیت کئی معنوں میں قابل تقلید تھی۔ انتہائی شریف، بااخلاق، محنتی، ہر دلعزیز تھے۔ وہ سرکاری ملازمت کی ذمہ داریوں کو بڑی خوبصورتی سے ادا کر رہے تھے۔ لاکھوں روپے ان کی تحویل میں ہوتے تھے مگر ایک، روپیہ کا سرکاری نقصان کو وہ اپنا ذاتی نقصان تصور کرتے تھے۔ نماز روزہ کے پابند، شیروانی ٹوپی میں ان کی شخصیت نمایاں حیثیت رکھتی تھی۔ مذہبی رجحان کے مالک تھے لہٰذا احرام اور حلال پر بہت زور دیتے تھے۔ رشوت کو غیر اسلامی اور سود کو حرام سمجھتے تھے۔ حسیب احمد تین بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ایک دن دونوں چھوٹے بھائیوں نے ان کے سامنے ایک تجویز رکھی۔

''بھیا...... ابو جان کے انتقال کے بعد ہم سب مختلف شہروں میں رہ رہے ہیں دفتری ذمہ داریوں کی وجہ سے ہمارا بار بار آنا مشکل ہو رہا ہے۔'''' یہ بات درست ہے۔ تم اپنا مدعا بیان کرو کہ کیا کہنا چاہتے ہو حسیب احمد نے کہا۔''دراصل ہماری خواہش ہے کہ ہم ساری جائداد کو تین حصوں میں تقسیم کرلیں''، کفیل احمد نے کہا۔''تاکہ ہر شخص اپنی جائداد کی خود دیکھ بھال کر سکے''۔

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے''حسیب احمد نے خوش ہو کر کہا۔

''جی ہاں۔ آخر آپ کب تک ہم سب کی ذمہ داریاں سنبھالیں گے'' مگر جائداد تین نہیں بلکہ صرف دو حصے میں تقسیم ہوگی، حسیب احمد نے کہا۔

''کیوں۔ تین حصے میں کیوں نہیں'' دونوں بھائیوں نے ایک زبان ہوکر پوچھا۔

''اس لیے کہ مجھے حصہ نہیں لینا ہے۔ تم دونوں شہر کے مکانات اور گاؤں کے کھیت اور باغات کو دو حصوں میں تقسیم کرلو'' حسیب احمد نے تجویز پیش کی۔

''مگر کیوں۔ آپ بھی اتنے ہی حقدار ہیں جتنے کہ ہم ہیں'' حفیظ احمد نے کہا۔

اس میں کیا شک ہے''۔

''پھر آپ اپنے حق سے کیوں دستبردار ہو رہے ہیں؟ آخر اسکی کوئی تو وجہ ہوگی'' کفیل احمد نے پوچھا۔

''وجہ ہے۔ مگر میں اس کی تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ میں قانوناً تحریر کردوں گا کہ میں اپنے حق سے دستبردار ہو رہا ہوں لہٰذا پوری جائداد کو میرے دونوں چھوٹے بھائیوں کے درمیان تقسیم کردی جائے۔ حسیب احمد نے کہا۔ انہوں نے دونوں بھائیوں کے سامنے اپنی ایک ایسی تجویز پیش کردی تھی جس کو سن کر دونوں بھائی سکتے میں آگئے تھے۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ یہ کیا ہوگیا۔ آخر بھیا اپنا حق کیوں نہیں لے رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا معمہ تھا جو ان کی سمجھ سے باہر تھا۔

حسیب احمد نے جب اپنی بیگم کو بتایا کہ انہوں نے اپنے حق سے دستبردار ہوکر پوری جائداد کو دونوں بھائیوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو فہمیدہ بیگم نے برجستہ پوچھا کہ ایسا فیصلہ کرنے کے پشت پر آپ کی منشاء کیا ہے مجھے بھی تو معلوم ہونا چاہئے۔

''منشاء۔؟ فہمیدہ۔ منشا بہت صاف ہے۔ میں نے اپنی صاف ستھری زندگی میں کبھی غلط پیسہ کو داخل ہونے نہیں دیا، حسیب احمد نے کہا وہ تو ٹھیک ہے۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں۔ بس تو اب تم کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوگی مگر میرے اس فیصلہ کی وجہ تسمیہ کو راز میں رکھنا

ہوگا"۔

"اگر ایسی بات ہے تو بلاشبہ بات ہم تک ہی محدود رہے گی"۔

"دیکھو فہمیدہ۔ ابو جان مرحوم اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے بڑے نیک انسان تھے مگر وہ کچہری کے ملازم تھے اور یہ ساری جائداد رشوت سے پیدا کی تھی جسے وہ لوگ بالائی آمدنی کہتے تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی کو سمجھایا۔

"پھر"۔ وہ بولیں۔

"پھر میں نے پوری جائداد کو دونوں بھائیوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

"حسیب احمد نے اپنے دل کی بات کہی" یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" فہمیدہ بیگم نے کہا اور سوچنے لگیں کہ میری حق دختری کے بارے میں معلوم نہیں ان کا کیا نظریہ ہے کیوں کہ ہمارا خاندان تو کئی پشتوں سے انجینئروں کے خاندان کے نام سے مشہور ہے۔ فہمیدہ بیگم کو فکرمند دیکھ کر حسیب احمد نے پوچھا۔

"کیا سوچنے لگیں۔ کیا تم کو میری یہ تجویز پسند نہیں آئی"۔ "نہیں نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔" فہمیدہ بیگم نے جواب دیا۔

"پھر کیا بات ہے؟ تمہارا اس طرح اچانک خاموش ہو جانا بے معنی نہیں ہوسکتا۔

"نہیں۔ ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ۔۔۔ اتنا کہہ کر وہ رک گئیں۔

"ہاں ہاں۔ بولو۔ کیا سوچ رہی تھیں"۔

"یہی کہ اگر میرے بھائی جان مجھے میرا حق دختری دیں تو کیا آپ اسے قبول کرنا پسند کریں گے۔"

"ہرگز نہیں۔"

"کیوں۔"

''اس لیے کہ خالو جان! ایسے محکمہ کے چیف انجینئر تھے جہاں سڑک بننے سے قبل ہی سرکاری طور پر اعلان کر دیا جاتا ہے کہ سڑک تیار ہوگئی ۔ سیمنٹ کی جگہ پر ریت کا استعمال کرنا معمول میں شامل ہوتا ہے۔ حسیب احمد اپنی بیگم کو سرکاری محکموں کی کارکردگی کی تفصیل بیان کرنے لگے۔ انہوں نے بتایا کہ گاؤں گاؤں تک کھیتوں میں سنچائی کا پانی پہنچانے کے لیے لمبی لمبی نہروں کی کھدائی کا کام ابھی شروع بھی نہیں ہوا کہ ٹھیکیداروں کو لاکھوں روپے کی ادائیگی کر دی گئی کہ نہر بن کر تیار ہوگئی ہے اور کھیتوں میں پانی پہنچنے لگا ہے۔

''بس بس۔ میں سمجھ گئی۔ کہ مجھے اپنی دختری نہیں لینی ہے''فہمیدہ بیگم نے کہا۔

کیا کہا۔ لینی تو دور کی بات ہے۔ ایسی دختری کے بارے میں سوچنا بھی گناہ ہے ''حسیب احمد نے کہا اور فہمیدہ بیگم نے سوچا کہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری دختری کی بات ان کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔

☆

(دوماہی ''گلبن'' لکھنؤ میں شائع ہوئی)

رشتہ

میں ان دنوں گورکھپور ہیڈکوارٹر میں پوسٹ تھا۔ میرے آفس میں لکھنؤ سے ایک بہت ہی ضروری فون آیا کہ میرے دوست ونود کمار کا انتقال ہوگیا ہے۔ میں ان کی بیٹی کو لے کر فوراً لکھنؤ کے لئے روانہ ہو جاؤں۔ ونود کمار کے انتقال کی خبر میرے لئے بہت ہی تکلیف دہ تھی، کیونکہ وہ میرے عزیز ترین دوست تھے۔ ان سے میرے قدیم تعلقات کا اندازہ اس بات سے بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی بیٹی شالو کو میں نے چھ ماہ کی عمر سے گود میں کھلایا تھا، جو اب خود تین بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ شالو کی سسرال گورکھپور میں تھی، جسے لے کر مجھے لکھنؤ جانا تھا۔ ونود کمار نے ہیڈکوارٹر میں بھی اپنی خدمات انجام دی تھیں۔ وہ اپنی ادبی، ثقافتی اور سماجی صلاحیتوں کی وجہ سے ملازمین اور اعلیٰ افسران کے درمیان بیحد مقبول تھے۔ بلیرڈ، کیرم اور شطرنج کے ماہر کھلاڑی تھے اور ان کھیلوں کے کئی شیلڈ حاصل کر کے اپنے محکمہ کا نام روشن کر چکے تھے۔ لہٰذا ان کی موت کی خبر پر ہر شخص نے افسوس کا اظہار کیا۔

میں دفتر سے براہِ راست شالو کے سسرال کرشنا نگر کالونی پہنچا۔ مین گیٹ کو کھولتے وقت میری نظر سفید پتھر پر کالے حروف سے لکھے نام ''رام پرکاش'' پر پڑی اور میرا ذہن اپنے مرحوم دوست ونود کمار کے سمدھی رام پرکاش سے انتہائی خراب تعلقات کی جانب چلا گیا۔ میں گیٹ پر ہاتھ رکھے سوچتا رہا کہ جس لڑکی کی بنیاد بنا کر دونوں خاندانوں کے ایک لمبے عرصے سے تعلقات خراب تھے کیا اس کو اس کے والد کے انتقال پر لکھنؤ جانے کی اجازت مل جائے گی۔ گزشتہ کئی سالوں سے بہو کو مائیکہ جانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ آج حالات تبدیل ہو چکے تھے، معاملہ ایک مظلوم بیٹی کا باپ کا آخری دیدار کا تھا۔ لہٰذا میں بلا جھجک پھاٹک کھول کر لان میں

داخل ہو گیا اور دالان میں کھڑے ہو کر کال بیل پر اُنگلی رکھ دی۔ دروازہ کھلا اور رام پرکاش برآمد ہوئے۔

''نمستے'' میں نے کہا۔

''نمستے'' انہوں نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا اور کہا، اندر آجایئے۔

میں جب ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہا تھا اسی وقت شالو کی نظر مجھ پر پڑ گی۔ چونکہ میرے دوست ونود کمار کے اپنے سمدھیانے سے تعلقات خراب چل رہے تھے، لہٰذا احتیاطاً میں نے شالو کی سسرال کی آمد و رفت کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ اپنی سسرال میں ایک طویل عرصہ کے بعد مجھے دیکھ کر شالو پریشان سی ہو گئی۔ اس نے سوچا ضرور کوئی خاص بات ہے۔ وہ میرے قریب آ گئی، جھک کر میرے پیر چھوئے اور بولی۔

''جعفری ماما۔ کیا بات ہے؟ سب خیریت تو ہے؟ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر نے لگے۔

''سب خیریت ہے۔ میں بھائی صاحب سے ملنے چلا آیا۔ تم اندر جاؤ۔ میں نے شالو کو سمجھایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، مگر وہ میری باتوں سے مطمئن نہیں ہوئی۔ چونکہ اس کے پاپا ایک لمبے عرصے سے بیمار چل رہے تھے اور وہ ان کو دیکھنے نہیں جا سکی تھی۔ لہٰذا اس کو میرا کئی سالوں کے بعد اچانک آنا معنی خیز لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ میری باتوں سے مطمئن نہیں ہوئی ہے کہ سب خیریت ہے۔ وہ مجھے آبدیدہ نظروں سے بغور دیکھتی ہوئی اندر چلی گئی۔

''بھائی صاحب! میں ایک بُری خبر لے کر آیا ہوں۔ میں نے رام پرکاش جی سے کہا۔

''جی کہئے''۔ انہوں نے بڑے خشک لہجے میں کہا۔

''مجھے یہ اطلاع دیتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ شالو کے پاپا کا آج شام انتقال ہو گیا، کل ان کا انتم سنسکار ہے''۔

''ٹھیک ہے''۔ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ انہوں نے اپنے سمدھی کے انتقال پر نہ افسوس کا اظہار کیا اور نہ میرے لئے ہمدردی کے دو بول کہے۔ جب کہ ان کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ ان کے سمدھی سے میرے کتنے گہرے تعلقات تھے۔ کوئی رشتہ نہ ہونے کے باوجود ہم رشتہ داروں سے بھی زیادہ قریب تھے۔

''آپ نے کیا سوچا ہے؟ میں نے ان سے دریافت کیا۔ اسی درمیان ان کی شریمتی جی آ گئیں۔ انہوں نے مجھے نمستے کیا اور بیٹھ گئیں۔ رام پرکاش جی نے ان کو شالو کے پاپا کے انتقال کی آہستہ سے اطلاع دی۔ ہمیں کیا سوچنا ہے'' رام پرکاش نے مجھ سے بڑی ترشی سے جواب دیا''۔

''کیوں۔ آپ کو کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے''؟

''دیکھئے بھائی صاحب''! رام پرکاش نے کہا'' میں ہارٹ کا مریض ہوں۔ اس لئے میں لکھنؤ نہیں جا سکتا۔'' اور آپ''۔ میرا اشارہ ان کی شریمتی جی کی طرف تھا جو ان کے بغل میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے جواب دینے سے قبل ہی رام پرکاش بول پڑے۔ یہ اپنے گٹھیا کے مرض سے پریشان ہیں۔ گھر میں چلنا پھرنا مشکل ہے، سفر کرنا تو دُور کی بات ہے۔

''بہت بہتر۔ میں نے آہستہ سے کہا اور حالات کو سمجھنے میں مجھے دیر نہیں لگی کہ خراب تعلقات کے زخم ابھی بھرے نہیں ہیں۔ میں نے شالو کے شوہر کے بارے میں دریافت کیا۔

''دھرمیندر، تو جائیں گے''؟

''نہیں۔ وہ بھی نہیں جا سکے گا''۔ رام پرکاش جی نے مجھ سے کہا۔'' اس کو آج ڈیوٹی پر برونی جنکشن جانا ہے۔

''ڈیوٹی پر کوئی اور چلا جائے گا''۔ میں نے دھیرے سے کہا۔

''کوئی دوسرا کیسے جا سکتا ہے۔ دفتر سے اس کے نام کا ڈیوٹی پاس اور لیٹر ایشو ہو چکا ہے۔ ٹرین کا ریزرویشن ہو چکا ہے۔ ابھی انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ میری آمد کی خبر سن کر

دھرمیندر اندر سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔اس نے جھک کر میرے پیر چھوئے اور اپنے والد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''بیٹا دھرمیندر۔شالو کے پاپا کا آج دیہانت ہوگیا ہے اور میں نے بھائی صاحب سے کہہ دیا ہے کہ تم کو سرکاری ڈیوٹی پر برونی جانا ہے''۔

''جی ہاں۔مجھے ضروری کام سے برونی جانا ہے مگر''۔دھرمیندر نے کہا۔

''اگر مگر کچھ نہیں بیٹا۔رام پرکاش نے کہا۔نوکری نوکری ہوتی ہے۔تم کیسے جاسکتے ہو''۔

''جی ہاں''۔کہہ کر دھرمیندر خاموش ہوگیا اور مجھے پورے ماحول کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔دھرمیندر انتہائی شریف لڑکا تھا اور میرے مرحوم دوست ونود کمار نے اس کی شرافت سے متاثر ہوکر ہی اپنی اکلوتی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا تھا۔مگر وہ والد کی ہٹ دھرمی کے آگے مجبور تھا۔رام پرکاش ہمیشہ اپنے بیٹے کی شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔دونوں خاندانوں کے خراب تعلقات کی وجہ بھی ان کی ضد تھی۔جس کے آگے ان کے بیٹے کو چوں کرنے کی ہمت نہیں تھی۔میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔میں بڑے تذبذب میں تھا کہ ان لوگوں کو کیسے سمجھاؤں۔

دوست کے مرنے کا غم اور اس کے سمدھیانے کا اتنا خراب رویہ کہ اس کے سمدھی، سمدھن کے علاوہ خود اس کے داماد نے ان کے انتم سنسکار میں شامل ہونے سے معذوری ظاہر کردی تھی۔اخلاقی طور پر بھی یہ بات صحیح نہیں تھی اور انسانیت کے خلاف تھی۔میں نے بڑی نرمی سے رام پرکاش جی سے کہا۔

''بھائی صاحب! بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ ونود کے مرنے کے بعد بھی پچھلی باتوں کو بھولے نہیں ہیں''۔''دیکھئے جعفری صاحب! آپ کچھ بھی کہئے۔یہاں سے کوئی نہیں جائے گا۔یہ میرا فیصلہ ہے''۔

''تب پھر آپ لوگ بھی میرا فیصلہ سن لیجئے''۔میں نے انتہائی غصہ کے عالم میں کہا۔

ڈرائنگ روم میں موجود تینوں افراد چونک کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میری آنکھوں میں غصہ دیکھ کر وہ سہمے ہوئے مجھے دیکھ رہے تھے۔

''آپ لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں''۔ میں نے کہنا شروع کیا اور وہ لوگ میری باتوں کو بغور سننے لگے۔

''ونود سے میرے تعلقات کا بھی آپ لوگوں کو علم ہے''۔

''جی ہاں''۔ سب نے ایک زبان ہو کر کہا۔

''شالو کو میں نے پیدا تو نہیں کیا ہے مگر وہ میری اپنی بیٹی سے کم نہیں ہے''۔

''اس میں کیا شک ہے''۔ دھرمیندر کی ماں نے آہستہ سے کہا۔

''تو کان کھول کر سن لیجئے کہ شالو آج رات کی ٹرین سے میرے ساتھ لکھنؤ جائے گی''۔

میری آواز تیز ہوگئی اور میں تھوڑا جذباتی ہوگیا۔ ''افسوس کہ آپ باپ کے مرنے پر بیٹی کے جذبات کو بھی نہیں سمجھ رہے ہیں''۔

ڈرائنگ روم میں چائے کی ٹرے لے کر داخل ہوتی ہوئی شالو نے میری بات سن لی اور ناشتہ کی ٹرے میز پر رکھ کر فرش پر بیٹھ گئی اور میرے دونوں پیروں کو پکڑ کر زار و قطار رونے لگی۔

''جعفری ماما۔ بھگوان کے لئے سچ سچ بتایئے کہ کیا بات ہے، میرے پاپا کیسے ہیں''؟

''بیٹا۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ تم تیاری کرو۔ ہمیں رات کی ٹرین سے صبح لکھنؤ پہنچنا ہے۔ میں نے کہا اور وہ روتی ہوئی اندر چلی گئی۔

''لیکن''۔ رام پرکاش جی بولے۔ ''لیکن اس کا بڑا بیٹا منوج نہیں جائے گا''۔

''کیوں؟ منوج کیوں نہیں جائے گا''؟ میں نے پوچھا۔

''اس لئے کہ اس کے اسکول کا ناغہ ہوگا۔ شالو چھوٹے بیٹے پنکج اور گود کی ممتا کو لے کر جا سکتی ہے''۔

''ٹھیک ہے''۔ میں نے ان سے مزید بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے میں خاموش ہو گیا۔

لکھنؤ جانے والی ٹرین کی سلیپر کلاس کی سائڈ کی صرف ایک برتھ ملی، جس پر شالو اپنے دونوں بچوں کو لے کر لیٹ گئی اور میں اس کے پیروں کے پاس بیٹھ گیا۔ پوری رات کا سفر، جنوری کا مہینہ اور مشرقی اُتر پردیش کی دل کو چیرنے والی ٹھنڈک، خدا کی پناہ۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں اور مسافر سکڑے ہوئے بیٹھے ہوئے تھے۔ شالو کے جسم پر میں نے کمبل ڈال دیا اور خود گرم ٹوپی پہن کر گلے اور کانوں کو مفلر سے بند کرلیا۔ کوٹ کے اوپر لانگ کوٹ ڈال لیا تاکہ سردی سے محفوظ رہ سکوں۔ رات کے دو بجے تھے اور ٹرین اپنی رفتار سے منزل کی جانب گامزن تھی اور اس کے ساتھ ہی میرے خیالات بھی پر لگا کر ماضی کی طرف بھاگنے لگے۔

''مجھے ریڈیو سیلون والوں نے بلایا ہے''۔ ایک دن ونود نے مجھ سے کہا۔

کیوں؟ تم کو کیوں بلایا ہے؟ میں نے پوچھا۔

اس لئے کہ وہ میری آواز کا آڈیشن لینا چاہتے ہیں۔ ان کو ریڈیو سیلون کے لئے ایک اناؤنسر کی ضرورت ہے۔'' ونود کمار نے بتایا''۔ اچھا، کہہ کر میں تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا اور سوچنے لگا کہ واقعی پورے ملک میں ریڈیو سیلون کا چرچا ہے۔ ہر شہر اور دیہات میں ریڈیو سیلون سنا جاتا ہے۔ صبح سات بجے بین الاقوامی شہرت یافتہ گٹار نواز دین شیلپے، مشہور فلمی نغموں کی دھنوں پر گٹار بجاتے تھے جسے سننے کے لئے لوگ پندرہ منٹ پہلے ہی ریڈیو کھول کر اس کے سامنے بڑی سعادت مندی سے بیٹھ جاتے تھے۔ یہ پروگرام بیحد مقبول تھا۔ اس لئے اس کو سننا نہیں بھولتے تھے۔

اچھا۔ تو تم اپنی نوکری چھوڑ کر سیلون چلے جاؤ گے؟ میں نے ونود سے پوچھا۔

''ارے، ابھی تو آڈیشن ہوگا، بہت سے اُمیدوار آئیں گے۔ دیکھا جائے گا کہ آگے کیا کرنا ہے''۔ ونود نے جواب دیا۔

'' بھئی سوچ سمجھ کر کچھ فیصلہ کرنا''۔ میں نے ونود کو سمجھایا۔ وہ میری بات مان گیا۔ مجھے اس بات کا خدشہ تھا کہ اس کی آواز ریڈیو کے لئے بہت موزوں ہے۔ کہیں اس کا انتخاب نہ ہو جائے اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر سیلون چلا جائے۔ اس کے پاس مرکزی حکومت کی مستقل نوکری تھی، اپنا ذاتی مکان تھا، اس لئے سب کچھ چھوڑ کر کسی غیر ملک ملازمت کرنے میں مجھے عقلمندی نظر نہیں آئی۔ لہٰذا میں نے یہ بات اس کی بیوی گیان وتی دیوی سے کہہ دی۔ گیان وتی میری منھ بولی بہن تھی۔ جسے میں پیار سے گیانو کے نام سے پکارتا تھا۔ ہر سال راکھی بندھوانا نہیں بھولتا تھا۔ کیونکہ میرے علاوہ اس کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ اسی مناسبت سے اس کے بچے مجھے ''جعفری ماما'' کے نام سے پکارتے تھے۔

'' کیوں بھئی۔ تمہارے آڈیشن کا کیا ہوا''؟ کئی دنوں بعد میں نے ونود سے پوچھا۔

''میرا اسلیکشن ہو گیا تھا''۔ ونود نے بتایا۔

پھر، میں نے حیرت سے پوچھا، جب سلیکشن ہو گیا تھا تو گئے کیوں نہیں؟

دیکھو بیٹا۔ ونود نے بے تکلفی سے کہا۔ ریڈیو سیلون کے امین درانی صاحب آئے تھے، رائل ہوٹل میں سب کا آڈیشن ہوا اور جیسا کہ تم جانتے ہو کہ بھگوان نے مجھے اچھی آواز دی ہے۔ اناؤنسر کے لئے میرا اسلیکشن کر لیا گیا۔

''پھر'' میں نے پوچھا۔

''پھر۔ درانی صاحب نے مجھ کو ہوٹل کے اس کمرے میں بلایا جس میں وہ ٹھہرے تھے اور بولے، ونود کمار صاحب۔ مبارک ہو کہ آپ کا سلیکشن ہو گیا ہے اور آپ کا نام میری لسٹ میں نمبر وَن پر ہے۔ آپ کے بعد دوسرے نمبر پر اتر پردیش کا ایک نوجوان نعیم فردوسی کا ہے جو اس وقت بے روزگار ہے اور اس کو نوکری کی تلاش ہے۔ آپ مرکزی حکومت کی ملازمت کر رہے ہیں۔ اس لئے میری خواہش ہے کہ آپ نعیم کے حق میں دستبردار ہو جائیں''۔

''اور۔ تم دستبردار ہو گئے''۔ میں نے کہا۔

''تو کیا کرتا''۔ ونود نے جواب دیا درانی صاحب کی باتوں سے میں بہت متاثر ہوا، پھر تم بھی نہیں چاہ رہے تھے کہ میں تمہاری بہن گیانو کو چھوڑ کر دوسرے ملک چلا جاؤں۔ اس نے کہا اور ہم دونوں ہنسنے لگے۔ شالو کی گود کی بیٹی ممتا کے رونے کی آواز سے میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ میں نے شالو کو جگایا جو باپ کے غم میں روتے روتے تھک کر سوگئی تھی۔ اس نے بیٹی کو گود میں لیا اور بیٹھ کر اسکوفیڈ کرنے لگی۔ میری طرف اُداس نظروں سے دیکھ کر بولی۔

''جعفری ماما۔ ممی کا اب کیا ہوگا؟ کہہ کر وہ رونے لگی۔ میں نے اس کو سمجھایا۔ تسلی دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے بیٹا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ گیانو اگر نوکری کرنا پسند کرے گی تو اس کو نوکری مل جائے گی، ورنہ تم سے چھوٹا شیلندر اٹھارہ سال کا ہو چکا ہے وہ سروس کرے گا۔ تم پریشان نہ ہو۔ سوجاؤ۔ لکھنؤ ابھی دُور ہے۔ وہ ممتا کو گود میں لے کر سوگئی اور پھر میں ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔

''میرا گورکھپور ٹرانسفر ہو گیا ہے۔ ایک دن ونود نے مجھ سے کہا۔

''اچھا۔ تو کب جا رہے ہو''؟ میں نے پوچھا۔ کب جا رہے ہو؟ اماں جائیں گے تو رہیں گے کہاں؟ ونود نے پوچھا۔

کیوں میری سسرال کس دن کام آئے گی۔ میں نے جواب دیا۔

''ارے ہاں''۔ وہ خوش ہو گیا اور ایک دن وہ اکیلے گورکھپور کے لئے روانہ ہو گیا۔

ونود کمار بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ اللہ تعالیٰ ایسے بہت کم لوگوں کو پیدا کرتا ہے جن کے اندر بیک وقت بے شمار خوبیاں ہوں۔ ونود اُردو کے شاعر اور ہندی کے کوی تھے۔ نعتیہ مشاعروں میں سب سے معیاری نعت ان ہی کی ہوتی تھی۔ شہر کے استاد شعراء بھی ان کی شاعری کی غیر معمولی صلاحیتوں کا لوہا مانتے تھے۔ اُردو ہندی کے علاوہ ان کو عربی زبان اور قرآن کی آیتوں سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ سورۂ فاتحہ کے علاوہ چاروں قل، سورۂ رحمٰن اور آیت الکرسی زبانی یاد تھی۔ آواز اچھی تھی۔ لہٰذا ان کو قرأت سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ عالمی شہرت یافتہ قاری محمد

عبدالباسط کی قرأت کے کیسٹ سن کر وہ بہت حد تک قرأت کے اصولوں سے واقف ہو گئے۔ جب بھی وہ خوش الحانی سے قرآن کی کسی آیت کی قرأت میں تلاوت کرتے تو بلا مبالغہ کسی شہرت یافتہ قاری کا گمان گزرتا تھا۔ لکھنؤ کی پرانی تہذیب وتمدن میں پرورش ہوئی تھی۔ مادری زبان اُردو تھی۔ لہٰذا لکھنوی طرز و انداز میں گفتگو کے عادی تھے۔ میں نے اپنے سسر مولوی صاحب کو صرف اتنا لکھ دیا کہ بیکل لکھنوی صاحب میرے عزیز دوست ہیں۔ باہری کمرے میں قیام کریں گے۔ باہری کمرہ کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ زنان خانہ سے بالکل الگ تھا اور ضروریاتِ زندگی کی ساری سہولتیں موجود تھیں۔

فجر کی اذان کی آواز سن کر مولوی صاحب گھبرا کر اٹھے اور اپنی بیگم کو جگایا۔ خدا کی بندی اذان ہوگئی ہے اُٹھو۔ دونوں ضروریات سے فارغ ہو کر نماز کی تیاری کرنے لگے۔ مولوی صاحب نے شیروانی اور ٹوپی پہنی، ہاتھ میں چھڑی لی اور مکان کا دروازہ کھولتے ہوئے مسجد پہنچ گئے۔ مسجد میں جب داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ ابھی رات کے دو بجے ہیں۔ لاحول پڑھتے ہوئے گھر واپس آئے، بیوی کو سارا ماجرہ سنایا۔ بیوی نے اتنا ہی کہا کہ خواب دیکھا ہوگا کہ اذان ہوگئی اور چل دیئے مسجد۔ بلاوجہ میری بھی نیند خراب کی۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ مولوی کی دوڑ مسجد تک۔

''وہ اذان میں نے دی تھی، ونود نے مجھ سے کہا جب میں نے اپنے سسر کا یہ دلچسپ قصہ سنایا''۔

''کیوں؟ تم نے کیوں دی''؟ میں نے پوچھا۔

''بھئی۔ دیکھو، تم تو جانتے ہو کہ رات کے ایک ڈیڑھ بجے تک کلب میں کبھی کیرم کا ٹورنامینٹ تو کبھی بلیرڈ کا چلتا رہتا ہے اور مجھے ان دونوں کھیلوں سے بے حد دلچسپی ہے''۔ ونود نے کہا۔

''پھر۔ آگے کہو۔ تمہارے ٹورنامینٹ سے اذان کا کیا تعلق ہے''۔ میں نے پوچھا۔

''پھر کیا۔ ایک دن رات کے دو بجے ٹورنامینٹ سے لوٹا۔ بستر پر لیٹا تو نیند نہیں آئی۔ سوچا لاؤ اذان ہی دے دوں۔ بس صحن میں کھڑے ہو کر اذان دے دی۔ ونود نے بتایا۔

''ارے کمبخت۔ صبح کی اذان عام اذانوں سے مختلف ہوتی ہے''۔ میں نے ونود سے کہا۔ ''بیٹا جعفری۔ تم نے مجھے کیا جاہل سمجھ لیا ہے؟ ونود نے جواب دیا، صبح کی اذان میں الصلاۃ خیر من النوم بھی کہا جاتا ہے جس کا مطلب ہے نماز نیند سے بہتر ہے۔ اس لئے تو جیسے ہی تیرے سسر گھر سے نکل کر مسجد کی طرف نماز کے لئے گئے میں چادر تان کر سو گیا۔ ہم دونوں ہنسنے لگے۔

لکھنؤ کے چار باغ اسٹیشن پر جب ٹرین رُکی تو اس وقت صبح کے سات بجے تھے۔ سخت ٹھنڈک تھی اور گھنے کہرے سے پورا اسٹیشن ڈھکا ہوا تھا۔ دس قدم پر کھڑے شخص کی شکل پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ میں نے ممتا کو گرم چادر میں لپیٹ کر گود میں لے لیا۔ پنکج کو منکی کیپ پہنائی اور شالو سے کہا تم نیچے اُترو۔ میں ممتا کو تم کو دیتا ہوں۔ شالو کمپارٹمنٹ سے اُتر کر گیٹ کے سامنے پنکج کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئی اور جیسے ہی میں نے ڈبہ سے اُتر کر ممتا کو شالو کی گود میں دیا میری نظر شالو کے بھائیوں پر پڑی۔ تینوں لڑکوں نے باری باری میرے اور بڑی بہن شالو کے جھک کر پیر چھوئے اور سامان نکالنے ڈبہ میں داخل ہو گئے۔ اس درمیان میں نے اپنی طرف آتے ہوئے دس پندرہ لوگوں کا مجمع دیکھا۔ میں نے ان میں ونود کمار کے بڑے بھائی وکیل صاحب کو پہچانا۔ وکیل صاحب مجھ سے لپٹ کر رونے لگے۔ میں نے ان کو دِلاسا دیا اور سمجھایا۔

''اتنی ٹھنڈک میں آپ لوگوں کو اسٹیشن آنے کی کیا ضرورت تھی''۔ میں نے کہا۔

''بھائی جعفری صاحب! پورا محلّہ آپ کے انتظار میں صدر کے چوراہے پر کھڑا ہے''۔ وہ بولے۔ ٹھیک ہے۔ اسٹیشن پر بچے آ گئے تھے، میں گھر پہنچ جاتا۔ آپ نے بلاوجہ تکلیف کی۔ میں نے کہا۔

میں شالو اور اس کے بچوں کو لے کر جب ونود کے گھر پہنچا تو وہاں ایک کہرام مچ گیا۔ مرد اور عورتیں سبھی بے اختیار رونے لگے۔ میری منھ بولی بہن گیان وتی دیوی مجھ سے روتی ہوئی

لپٹ گئی۔ میں ے دیکھا کہ ونود کا جنازہ رکھا ہوا ہے اور سیکڑوں کی تعداد میں مرحوم کے رشتہ دار دوست اور اہل محلہ ان کے آخری سفر میں ساتھ دینے کے لئے موجود ہیں۔ وکیل صاحب نے مجھ سے کہا۔

''جعفری بھائی۔ ہمیں جب یہ معلوم ہوا کہ ونود کے سمدھیانے سے کوئی نہیں آ رہا ہے تو بڑا دُکھ ہوا''۔

''جی ہاں۔ افسوس کی بات ہی ہے''۔ میں نے کہا۔

''یہ سوچ کر بیحد پریشانی تھی کہ شالو اتنے چھوٹے بچوں کو لے کر اتنے خراب موسم میں اکیلے کیسے سفر کرے گی''۔ انہوں نے کہا۔

''جی''۔

''مگر جب یہ خبر آئی کہ شالو اپنے جعفری ماما کے ساتھ رات کی ٹرین سے لکھنؤ کے لئے روانہ ہو چکی ہے تو ہم سب کو اطمینان ہوا۔ وکیل صاحب نے کہا بھائی صاحب۔ آپ کا احسان ہم زندگی بھر نہیں بھول سکتے''۔

''ارے۔ اس میں احسان کی کیا بات ہے، احسان تو اس پروردگار کا ہے جس نے ہمیں اس لائق بنایا کہ ہم کسی کے کام آ سکے۔ میں نے جواب دیا وکیل صاحب، ونود میرا سب سے قریبی دوست تھا، اس کے مرنے کا جتنا دُکھ آپ کو ہے اتنا ہی مجھے بھی ہے۔ ونود تو میری زندگی کی ساری خوشیاں لے کر چلا گیا''۔ اتنا کہہ کر میں خود رونے لگا۔

''دھنیہ ہو۔ ایک اسّی سالہ بزرگ نے کہا۔ آج بھی ایسے مہان پرش ہمارے دیش میں ہیں''۔

''جی ہاں''۔ وکیل صاحب بولے۔ ''جو اپنے ہندو دوست کے دیہانت پر آنسوؤں سے رو رہے ہیں''۔

بزرگ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا'' اور ان کے بچوں کو لے کر اس ٹھنڈک

میں رات بھر کا سفر کر کے گورکھپور سے لکھنؤ آئے ہیں''۔

''آپ ایسی باتیں نہ کہیں''۔ میں نے کہا۔''میں تو ایک معمولی انسان ہوں۔ مہان تو صرف خدا کی ذات ہے۔جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے۔ میں نے تو صرف اپنے خدااوراس کے پیغمبرؐ کے حکموں کا پالن کیا ہے۔ کسی پر کوئی احسان نہیں کیا''۔

......☆......

(دوماہی ''گلبن'' لکھنؤ کے نومبر/ دسمبر ۲۰۰۸ء کے شمارہ میں شائع ہوا)

ثمرہ

مسٹر رحمٰن......ڈائریکٹر نے اپنے اسسٹنٹ سے مخاطب ہوکر کہا۔
یس سر۔ رحمٰن صاحب حسب عادت ہاتھ باندھے ان کے سامنے کھڑے ہوکر بولے۔
آپ کچھ دنوں سے پریشان رہ رہے ہیں۔ کیوں؟
"نہیں سر......ایسی کوئی بات نہیں ہے"۔
میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کچھ اُداس رہنے لگے ہیں۔ آپ بلا جھجک بتائیں کہ کیا بات ہے؟
اپنے محکمہ کے سب سے اعلیٰ افسر کی زبانی ہمدردی کے الفاظ سن کر رحمٰن صاحب آبدیدہ ہو گئے اور آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ بولے۔
سر...... میری ماں، بہت بیمار ہیں۔ جن کی وجہ سے میں تھوڑا پریشان ہوں۔
ارے تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ آپ کی مدر ٹھیک ہو جائیں گی۔
جی سر
دیکھئے......اپنی مدر کا اچھے سے اچھے ڈاکٹر سے علاج کرائیے اور مجھ سے جس طرح کی مدد کی ضرورت ہو بلا تکلف بتائیے۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔
یس سر...... کہہ کر وہ سوچنے لگے کہ اچھے ڈاکٹر کے علاج کے لئے بہت پیسوں کی ضرورت ہے۔ دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ کی چھوٹی سی ملازمت میں پانچ چھ افراد پر مشتمل خاندان کی ضرورتیں ہی بمشکل پوری ہوتی ہیں۔ مہینہ بھر کا راشن، تیل، صابن، شکر وغیرہ پر سو روپیہ کا خرچ

تھا۔ دو کمروں کے مکان کا کرایہ پچاس روپیہ مہینہ تھا۔ بچے کی انگلش میڈیم اسکول کی فیس بیس روپیہ تھی۔ بکرے کا مٹن چھ روپیہ سیر اور دیسی گھی دس روپیہ سیر فروخت ہو رہا تھا۔ پھر بھی یہ نعمتیں ہر ایک کے نصیب میں نہیں تھیں کیونکہ بہت کم لوگوں کے پاس پیسہ تھا۔

معاشی تنگی نے رحمٰن صاحب کو کبھی سکون سے جینے نہیں دیا۔ قلیل آمدنی اور سیکڑوں اخراجات بچوں کی پرورش اور تعلیم کے علاوہ وسیع خاندان کا بوجھ بھی تھا۔ کبھی کسی کی شادی کی تقریب میں شرکت ضروری تو کبھی کسی کی موت پر حاضری لازمی۔ دارالحکومت میں مقیم ہونے کی وجہ سے خاندان کے قریبی اور دُوری رشتہ داروں کی اپنی ذاتی ضرورتوں سے آنا اور ہفتوں قیام کرنا معمول میں شامل تھا۔ رحمٰن صاحب کے دماغ میں بچپن سے یہ بات گھر کر گئی تھی کہ مہمان کی آمد برکت کی نشانی ہے اور مہمان اپنا رزق خود لے کر آتا ہے۔ لہٰذا کبھی کسی کے چہرہ پر شکن تک نہیں آتی کہ کہاں سے خاطر خواہ تواضع ہوگی۔ چھ افراد کے اخراجات کے علاوہ ضعیف والدہ کی لمبی علالت کا سلسلہ رحمٰن صاحب کیلئے پریشانی کا باعث تھا، مگر والدہ کے علاج میں انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ گھر کی قیمتی چیزوں تک کو فروخت کر دیا۔

رحمٰن صاحب کی والدہ کا علاج شہر کے سب سے بڑے اور مشہور ڈاکٹر کا ہو رہا تھا۔ جن کی گھر آ کر مریض کو دیکھنے کی فیس پچیس روپیہ تھی۔ معاشی تنگی کے باوجود رحمٰن صاحب اپنی والدہ کے علاج کی طرف سے غافل نہیں ہوئے۔ ان کو اپنی ماں سے بیحد محبت تھی، اس لئے وہ ان کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ سوچنے لگے کہ ان کی ماں اس وقت بیوہ ہوئیں جب وہ محض دو مہینے کے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی پرورش اور تعلیم کی ساری ذمہ داریاں ان کی ماں کے کمزور کندھوں پر آ گئیں۔ اس وقت گھر کی مالی حالت بیحد خراب تھی۔ کوئی معقول ذریعہ آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے ان کی ماں کو عسرت اور تنگ دستی کے عالم میں چھوٹے موٹے کام کر کے اپنے اکلوتے بیٹے رحمٰن کی پرورش کرنی پڑی۔ کبھی کسی لڑکی کی شادی کا غرارہ سل کر، کبھی بچیوں کو قرآن شریف پڑھا کر کچھ پیسے حاصل کر لیتی تھی، جس سے کسی طرح گزر بسر ہو رہا تھا۔ اچھا کھانا اور اچھا

کپڑا ان کے لئے خواب کی باتیں تھیں۔ وہ بہت خوددار خاتون تھیں۔ کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اگر کسی متمول رشتہ دار نے مدد کی پیشکش کی تو شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ کسی کا احسان لینا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ اپنی موجودہ غربت کی زندگی سے مطمئن تھیں۔ پندرہ سال کی عمر میں ان کی شادی ہوئی تھی۔ ایک سال بعد رحمٰن کی پیدائش ہوئی اور پھر انہوں نے پوری زندگی بیوگی میں گزار دی۔ زبان پر شکایت کا کبھی ایک لفظ نہیں لائیں۔

''مسٹر رحمٰن'' اُن کے باس نے ایک دن پوچھا۔

'یس سر''

''آپ کی مدر کا کیا حال ہے''؟

''کیا بتائیں سر...... چلنے پھرنے سے معذور ہو چکی ہیں۔ پلنگ پر پڑی ہوئی ہیں۔ انہوں نے بھاری دل سے جواب دیا۔ زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہیں۔

''ساری''...... آپ کو دفتر سے جتنے قرض کی ضرورت ہو درخواست دیجئے میں منظور کرتا ہوں۔ علاج میں کوتاہی نہیں ہونی چاہئے، سمجھے۔

''بہت بہتر جناب''...... رحمٰن صاحب باس کے چیمبر سے نکل کر اپنی کرسی پر بیٹھ کر قرض کا فارم بھرنے لگے۔ انہوں نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ کیونکہ سارے قریبی دوستوں اور عزیزوں کے قرض کے بوجھ سے دب چکے تھے۔ دفتر سے قرض ملنے میں تاخیر نہیں ہوئی۔ والدہ کی بیماری کی معقول وجہ اور ڈائریکٹر کے حکم سے ایک ہفتہ میں قرض منظور ہو گیا۔

دوسو روپیہ تنخواہ پانے والے ملازم رحمٰن صاحب کو جب پانچ سو روپے کا قرض منظور ہوا تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سمائے۔ ایسا لگ رہا تھا گویا ان کو قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔ وہ بیحد خوش تھے کہ اب وہ اپنی والدہ کا لمبے عرصہ تک علاج کر سکیں گے اور ان کی امی جان بہت جلد صحت یاب ہو کر پہلے کی طرح چلنے پھرنے کے لائق ہو جائیں گی۔ وہ ہمیشہ اپنی ماں کے بارے میں بہت جذباتی ہو کر سوچتے تھے، وہ اکثر اپنی شریک حیات عارفہ سے کہا کرتے تھے کہ ماں کی طرف محبت

سے دیکھنا ایک حج کے ثواب کے برابر ہے۔ عارفہ کا تعلق بھی ایسے خاندان سے تھا جہاں بزرگوں کی خدمت کو فرض تصور کیا جاتا تھا اور خوشی محسوس کی جاتی تھی۔ اس جذبہ کے تحت کہ بزرگوں کی خدمت ثواب کا کام ہے اور ثواب کے کام کا اجر اللہ تعالیٰ ضرور مرحمت فرماتے ہیں۔ عارفہ نے اپنی خوش دامن کی بے انتہا خدمت کی۔ ان کا نظریہ تھا کہ امی جان جوانی میں ہی بیوہ ہو گئیں۔ سولہ سال کی کمسن اور خوبصورت بیوہ کے لئے خاندان کے کئی نوجوان اور کنوارے رشتہ داروں نے نکاح ثانی کی پیشکش کی۔ مگر امی جان نے ہر رشتہ کو ٹھکرا کر دو مہینے کے بیٹے رحمٰن کو اپنے سینے سے لگالیا اور زندگی کی اندھیری اور مشکل راہ پر تنہا چل پڑیں۔ انہوں نے دوبارہ شادی کے بارے میں کبھی سوچنا بھی گوارہ نہیں کیا۔ عارفہ نے سوچا کہ امی جان نے میرے شوہر کو پیدا کیا، پرورش میں تکلیفیں اُٹھائیں، تعلیم کے لئے فاقے کیے۔ لہٰذا اُن کا حق کسی طرح اَدا نہیں ہوسکتا۔

''بیٹا رحمٰن'' ......ان کی والدہ نے مُردہ آواز میں پکارا۔

''جی امی جان'' ......رحمٰن اور عارفہ ان کے پلنگ کے قریب آ گئے۔

''تم لوگ......'' وہ آہستہ آہستہ بولیں۔ تم لوگ میری وجہ سے بہت پریشان ہو رہے ہو۔

''آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں امی جان'' ......رحمٰن نے فرطِ محبت میں اپنی ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر جذباتی لہجہ میں کہا...... ''آپ کے لئے ہم اپنی جانیں قربان کر دیں گے''۔

''بیٹا......میرے علاج پر بہت پیسہ خرچ ہو رہا ہے''۔ بہت ہی نحیف آواز میں انہوں نے کہا۔

امی جان...... آپ پیسوں کے بارے میں بالکل فکر نہ کریں۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے۔

''بیٹا''......میرا آخری وقت اب قریب ہے۔ اپنا پیسہ مت برباد کرو۔

''امی جان...... یہ نہ کہیے ورنہ میں مر جاؤں گا۔ رحمٰن صاحب نے اپنی ماں کو جھک کر گلے سے لگالیا اور رونے لگے۔ اگر آپ نہ رہیں تو میں کس کے سہارے زندہ رہوں گا۔ امی جان میری خطاؤں کو معاف کر دیجئے۔ میں آپ کا حق ادا نہیں کر سکا۔ مجھے معاف کر دیجئے''۔ رحمٰن صاحب کو عارفہ نے سنبھالا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ امی جان انشاء اللہ جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔ یہ کہہ کر وہ بھی رونے لگیں۔ کیونکہ ان کو بھی موجودہ حالت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ ان کو روتا دیکھ کر بچے بھی رونے لگے۔ رونے کی آواز سن کر پڑوس کے کئی گھروں سے لوگ یہ سمجھ کر باہر نکل آئے کہ رحمٰن صاحب کی بیمار ماں کا انتقال ہو گیا۔

کئی مہینے تک امی جان کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ علاج ہوتا رہا۔ بیٹے بہو ان کی خدمت میں لگے رہے۔ آفس سے ملا ہوا قرض ختم ہو گیا۔ گھر کی ساری قیمتی اشیاء وہ پہلے ہی فروخت کر چکے تھے۔ دفتر میں کام کرتے وقت رحمٰن صاحب اسی ادھیڑ بُن میں تھے کہ کہاں سے پیسہ آئے کہ امی جان کے علاج کا سلسلہ رکنے نہ پائے کہ اچانک ایک خیال ان کے ذہن میں کوندا۔ ان کی آنکھوں میں چند لمحوں کے لئے چمک سی آ گئی۔ انہوں نے اپنے دفتر کے چپراسی رام پرشاد کو بلایا۔ ''رام پرشاد......''

''جی صاحب''۔ رام پرشاد نے کہا۔

''رام پرشاد...... مجھے ڈاکٹروں نے زیادہ سے زیادہ پیدل چلنے کے لئے کہا ہے۔ جس سے میرا شوگر لیول نارمل ہو جائے گا۔ اس لئے میں نے طے کیا ہے کہ میں اپنی سائیکل بیچ دوں''۔ رحمٰن صاحب نے کہا۔

''ہاں صاحب...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میرے پاس سائیکل نہیں ہے میں ہی خرید لوں گا''۔ رام پرشاد چپراسی نے یہ کہہ کر رحمٰن صاحب کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔

رحمٰن صاحب کی سائیکل بک گئی اور وہ سارا پیسہ امی جان کے علاج پر خرچ

ہو گیا۔اب وہ گھر سے دفتر تقریباً تین میل پیدل جانے لگے۔وہ اس بات سے بیحد مطمئن تھے کہ امی جان کا علاج ہو رہا ہے۔زندگی اور موت تو مالک کائنات کے ہاتھوں میں ہے۔امی جان کچھ کہنا چاہ رہی تھیں مگر انکی آواز حلق تک آ کر اٹک جا رہی تھی۔لہٰذا رحمٰن صاحب نے اپنی امی کے منھ کے پاس اپنے کان لگا دیئے تا کہ ان کی باتوں کو سن سکیں۔امی اپنی کمزور آواز میں کہہ رہی تھیں۔

''بیٹا رحمٰن''۔

''جی امی جان''۔

''بیٹا......تم نے بہت خدمت کی۔میری دُعائیں تمہارے ساتھ ہیں بیٹا''......

''نہیں امی......میں تو کچھ نہیں کر پایا...... یہ کہہ کر وہ آبدیدہ ہو گئے۔

''بہت کر رہے ہو تم لوگ......جس نے ماں کی خدمت کی اس نے جنت میں اپنی جگہ بنالی''۔پھر رُک کر بہت ہی کمزور آواز میں بولیں۔

''تم اور تمہارے بچے بہت ترقی کریں گے......آسمان کو چھوئیں گے...... یہ میرے دل سے نکلی دُعا ہے۔

امی......آپ بس ہماری خطاؤں کو معاف کر دیں، کہہ کر وہ رونے لگے۔

عارفہ نے رحمٰن صاحب کو سمجھانے کی کوشش کی کہ پریشان نہ ہوں۔علاج ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ امی جلد صحت یاب ہو جائیں گی۔مگر ان کو اپنی کم مائیگی کا صدمہ تھا۔انہوں نے عارفہ سے کہا۔

''عارفہ......قدرت کا عجب نظام ہے کہ جن کے والدین حیات ہیں ان کے پاس پیسہ نہیں ہے اور جن کے پاس دولت کی ریل پیل ہے ان کے والدین نہیں ہے''۔

''آخر وہ منحوس دن آ گیا جب امی جان سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملیں۔عیش باغ کا قبرستان ان کی آخری آرام گاہ بن گیا''۔

امریکن ایئر لائنس کی بوئنگ ۷۸۷ کی دہلی، شکاگو کی پندرہ گھنٹوں کی براہِ راست

فلائٹ میں سفر کرتے ہوئے عارفہ نے جب بغل میں نیم دراز رحمٰن صاحب کی طرف دیکھا جو آنکھوں پر نائٹ کیپ لگائے نیند میں سبک سبک کر رو رہے تھے تو وہ گھبرا گئیں۔ یا اللہ...... ان کو کیا ہو گیا۔ انہوں نے رحمٰن صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دریافت کیا۔

''کیا بات ہے؟''

''ایں......'' گھبرا کر رحمٰن صاحب نے آنکھوں سے کیپ ہٹایا اور گھبرائی ہوئی نظروں سے پلین میں بیٹھے مسافروں کو غور سے دیکھنے لگے۔

''آپ کو کیا ہو گیا...... کیوں پریشان ہیں''؟ عارفہ نے پوچھا۔

''عارفہ...... امی جان کے انتقال کو کتنے سال ہو گئے۔ انہوں نے عارفہ سے سوال کیا۔

''اس رمضان کی اٹھارہ تاریخ کو پورے چالیس سال ہو جائیں گے''۔ مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟

چالیس سال پہلے جب میں ایک معمولی کلرک تھا...... امی جان کی آخری بیماری اور علاج کا خواب دیکھ رہا تھا۔

''اوہ......'' یہ بات ہے۔ عارفہ نے کہا۔

ہاں...... وہ سارے منظر میری نظروں کے سامنے آ گئے جو ہم نے چالیس سال قبل گزارے تھے۔ یہ امی جان کی دُعاؤں کا ثمرہ ہے کہ آج ہمارے بچے انگلینڈ، امریکہ اور کناڈا میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔

اس میں کیا شک ہے...... عارفہ نے کہا۔

اور آج ہم اپنے بیٹے سے ملنے امریکہ جا رہے ہیں۔ رحمٰن صاحب نے کہا۔

مگر...... دیکھیے'' عارفہ نے فوراً درمیان میں کہا...... شکاگو میں ایک مہینہ رہنے کے بعد ہم بیٹی سے ملنے انڈیاناپلس (Indianapolis) جائیں گے۔

''ہاں ہاں بھئی۔ بیٹی سے بھی ملنے جائیں گے اور تمہاری مرضی سے رہیں گے''۔

''جی ہاں......جلدی نہ کیجئے گا کہ دہلی چلو''۔

جلدی کیوں کروں گا۔تم دونوں ماں بیٹی کو گھنٹوں ڈسکشن جو کرنا ہے کہ آج کل انڈیا میں کپڑوں کا کیا فیشن چل رہا ہے۔رحمٰن صاحب نے کہا اور پھر دونوں ہنسنے لگے۔اتنے میں جہاز کے کاک پیٹ سے اعلان ہوا۔''وی آر اباؤٹ ٹو ریچ اوہایو ایئرپورٹ''۔

ہم تھوڑی دیر میں اوہایو ایئرپورٹ پہنچنے والے ہیں۔

......☆......

(روزنامہ ''آگ''لکھنؤ۔جمعہ ۱۹ ستمبر ۲۰۰۸ء)

نجیب الطرفین

''جناب آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ سید اولاد حسین نے کہا۔

''کیوں؟۔ میں نے کون سی عجیب بات کہہ دی؟'' اختر صاحب نے جواب دیا۔

''بھئی۔ میں اپنی بیٹی کو غیر کُف میں کیسے دے سکتا ہوں''

''غیر کف۔ کیا وہ لوگ مسلمان نہیں ہیں؟''

''ہیں۔ بیشک ہیں۔ مگر آپ کو اچھی طرح اس بات کا علم ہے کہ ہم نجیب الطرفین ہیں''

''اس میں کیا شک ہے۔ آپ کے نجیب الطرفین ہونے سے کس کمبخت کو انکار ہو سکتا ہے''۔

''پھر۔''

''پھر یہ کہ کیا آپ کو کوئی سید لڑکا ملا جس کو آپ داماد ہونے کا شرف بخش سکیں؟''

''نہیں۔''

''تو پھر کب تک آپ اپنی لختِ جگر کو گھر بٹھائے رکھئے گا اولاد حسین صاحب؟

''وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر بھئی اختر صاحب۔ آپ ہی بتائیں کہ آج حالت یہ ہوگئی ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کون کیا ہے؟''

''درست فرمایا آپ نے۔''

''آزادی سے پہلے جو رذیل تھے آج وہ شریف النفس ہو گئے۔''

''یہ سب زمانہ کے تغیرات ہیں سید صاحب۔ حالات سے سمجھوتہ کرنے میں ہی

دانشمندی ہے۔'' اختر صاحب نے مشورہ دیا۔

''سمجھوتہ؟'' کیا مطلب؟۔ کیا میں اپنی بیٹی کو کسی غیر سید میں دے دوں۔''

''کیوں۔ اس میں کیا مضائقہ ہے؟''

''ارے میاں۔ خاندان میں جو آج تک نہیں ہوا وہ میں کیسے کر سکتا ہوں''

''تو پھر بیٹھے رہئے سید لڑکے کے انتظار میں''

''بھئی اختر صاحب۔ آپ میرے دوست ہیں۔ بخدا آپ تو ایسا نہ کہیں''۔

''تو پھر کیا کہوں؟۔ زمانہ بدل گیا ہے اب زمانہ کے ساتھ چلنے کی عادت ڈالئے ورنہ زمانہ آپ کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جائے گا اور آپ غبار دیکھتے رہ جایئے گا۔

''ارے واہ۔ عجیب منطق ہے جناب آپ کی۔ اگر میں اپنی بیٹی کی شادی کسی غیر خاندان میں کر دوں تو زمانہ میرے ساتھ چلے گا''۔

''نہیں۔ محترم آپ زمانہ کے ساتھ چلیں گے۔ نیچ اور اونچ کا فلسفہ بند کیجئے اور حقیقت کی دنیا میں آنکھیں کھولئے اور دیکھئے کہ کتنے سید لڑکے آپ کی نظروں میں تعلیم یافتہ ہیں۔''

''ایک بھی نہیں۔ ''تعلیم یافتہ تو اب وہ قومیں ہیں جو کبھی جاہل ہوا کرتی تھیں''

''بس۔ پھر بسم اللہ کیجئے۔ اور شریف برسر روزگار لڑکا دیکھ کر نسرین کے ہاتھ پیلے کر دیجئے۔

''مگر۔''

''مگر کیا''

''مگر خاندان کو میں کیا منہ دکھاؤں گا۔ لوگ کیا کہیں گے کہ سید اولاد حسین زمیندار کی بیٹی فلاں رعیت کے گھر چلی گئی۔''

''بھائی اولاد حسین۔ آپ یہ نہ بھولیں کہ اب نہ کوئی زمیندار ہے اور نہ کوئی رعیت''

''نہ ہوں۔ مگر پرانی قدریں تو ہیں۔ ان کا ہم کیا کریں گے؟''

''اب ان پرانی قدروں کو دفن کر دیجئے۔ کیوں کہ اب قدریں بدل رہی ہیں آپ بھی بدل جایئے ورنہ زمانہ آپ کو بدل دے گا''۔ اختر صاحب نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''آپ بھی کیسی باتیں کر رہے ہیں اختر صاحب۔ جو اسامی لگان کی ادائیگی کے لیے دروازہ پر جھلک جھک کر سلام کرتے تھے کیا ہم ان سے رشتہ کر لیں؟''

''کیا قباحت ہے رشتہ کرنے میں اگر وہ صاحب ایمان ہیں''۔

''آپ کی تاویل سے میں کسی حد تک متفق ہوں مگر بھائی اختر صاحب کل کا نوکر جمّن آج سید ضامن علی کہلانے لگے تو کیا اس کا شمار شرفاء میں ہونے لگے گا؟''

''کیوں نہیں ہوگا۔ دو پشتوں کے بعد جمن کو کوئی جاننے والا نہ ہوگا اور ساری دنیا صرف سید ضامن علی صاحب کے خاندان کو پہچانے گی۔''

سید اولاد حسین اور اختر صاحب بچپن کے دوست تھے۔ اختر صاحب نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد مختلف کاروبار کیے۔ کسی بھی کام کو کرنے میں شرم محسوس نہیں کی۔ کبھی دکان داری کی تو کبھی آٹا چکی لگوا کر بیٹھ گئے۔ ان کو اس حقیقت کا علم ہو چکا تھا کہ زمینداری ختم ہو چکی ہے اور اگر ہم نے خود کوئی کام نہ کیا تو اس کا خمیازہ ان کے پورے خاندان کو بھگتنا پڑے گا۔ ضعیف والدین کے علاوہ بیگم اور چھ عدد بچوں کی پرورش کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر تھی۔ آزادی کے بعد ملک میں ترقی کے دور کا آغاز ہوا۔ از سر نو ترقیاتی کاموں کی پورے ملک میں شروعات ہوئی۔ ملک کو بجلی پانی اور سڑکوں کی سخت ضرورت تھی لہٰذا حکومت نے ان کاموں کے ٹھیکے دینے شروع کیے۔ پلوں اور رہائشی مکانات کی تعمیر کا کام شروع ہوا اور اختر صاحب نے ایسے سنہرے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ٹھیکیداری کا باعزت پیشہ اختیار کر لیا۔ ان ترقیاتی کاموں میں ہزاروں بے روزگار نوجوانوں کو روزی مل گئی اور ٹھیکیدار صاحبان کو زبردست مالی فائدہ ہونے لگا۔ اس کے برعکس ان کے دوست سید اولاد حسین اپنی چار جوان بیٹیوں کی شادی کی فکر میں دن بدن کمزور ہونے لگے۔ بڑی بیٹی نسرین عمر کی تیس بہاریں دیکھ چکی تھیں اب وہ اپنی چھوٹی بہنوں کے لئے

رشتے تلاش کرنے لگیں۔ اولاد حسین بہت سست اور مضمحل رہنے لگے اور ان کی صحت دن بدن گرنے لگی۔

اختر صاحب کے کاروباری ساتھی اور شہر کے سب سے بڑے رئیس غنی احمد صاحب نے جب اپنے اکلوتے بیٹے کا رشتہ نسرین کے لیے دیا تو اولاد حسین صاحب اپنے عزیز ترین دوست اختر صاحب کے ہمراہ غنی احمد صاحب سے ملاقات کرنے ان کی کوٹھی ''غنی منزل'' پہنچے۔ اختر صاحب غنی احمد کے اعلیٰ طور طریقے سے بے حد متاثر تھے۔ بقول ان کے اعلیٰ خاندان کا خون رقصاں تھا۔ خود ان کی طرف سے سید اولاد حسین کی بیٹی نسرین کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے شبیر احمد کا رشتہ آنا ہی ان کی اعلیٰ ظرفی کی زندہ مثال تھی۔

شبیر احمد امریکہ میں انجینئر تھے اور لاکھوں روپے ماہانہ تنخواہ پر ایک بڑی کمپنی میں ملازم تھے۔

''غنی منزل'' کا مین گیٹ کھلا اور ایک ملازم نے لمبے چوڑے خوبصورت لان سے گذرتے ہوئے ہال نما ڈرائنگ روم تک رہنمائی کی اور اندر چلا گیا۔ دونوں حضرات نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لینا شروع کیا۔ بہت بڑے ہال میں دیوار سے دیوار تک ایرانی قالین بچھی ہوئی تھی۔ چار بڑے اور قیمتی صوفے سے ڈرائنگ روم مزین تھا۔ دیواریں پلاسٹک پینٹ کی ہوئی تھیں، اور روشنی کا ایسا نظام تھا کہ آنکھیں چکا چوندھ ہو رہی تھیں۔ ہال کے درمیان میں ایک قیمتی فانوس چھت سے لٹک رہا تھا جس سے چاروں طرف روشنی پھیل رہی تھی۔ ڈرائنگ روم کی دیواروں پر خاندان کے بزرگوں کی قدِ آدم آئل پینٹ تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ جن میں گذشتہ دور کے نوابین شاہی لباس زیب تن کیے تلواروں پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے۔ ہال میں لگی ان جاذب نظر اور نایاب پینٹنگ پر سید اولاد حسین کی نظریں اٹک گئیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی اور وہ کھڑے ہو کر تقریباً ہر قدِ آدم تصویر کا بغور معائنہ کرنے لگے۔ اتنے میں ہال کا اندرونی دروازہ کھلا اور ایک لحیم شحیم شخصیت برآمد ہوئی۔

''مجھے غنی احمد کہتے ہیں۔ انہوں نے اولاد حسین کو مخاطب کر کے کہا۔'' آپ لوگ تشریف رکھیں۔'' سبھی صوفے پر بیٹھ گئے۔

''اختر بھائی! کیسے مزاج ہیں؟'' غنی احمد نے اختر صاحب سے خیریت دریافت کیا جن سے ان کے کاروباری تعلقات تھے۔

''الحمدللہ۔ سب خیریت ہے جناب۔ اختر صاحب نے جواب دیا اور اولاد حسین کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ آپ سید اولاد حسین صاحب ہیں۔''

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر'' غنی احمد نے سید اولاد حسین کو مخاطب کر کے کہا مگر اولاد حسین کسی گہری سوچ اور فکر میں غرق تھے۔ ان کی خاموشی سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ غنی احمد کی اعلیٰ حیثیت سے متاثر ہیں یا کوئی اور بات ہے۔ ان کی خاموشی بے معنی نہیں تھی وہ بغور تمام اشیاء کا جائزہ لے رہے تھے۔ طویل انتظار کے بعد انہوں نے زبان کھولی اور بولے۔

''آپ کی آئل پینٹنگ سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں''۔

''بہت بہت شکریہ۔'' غنی احمد نے جواب دیا۔'' یہ میرے بزرگوں کی تصویریں ہیں'' مگر حضرت۔'' انہوں نے غنی احمد سے سوال کیا۔ ان تصویروں میں میرے والد میرے دادا اور میرے پردادا کہاں سے آ گئے''۔

''آپ نے غالباً مجھے پہچانا نہیں؟'' غنی احمد نے سوال کیا۔

''نہیں۔ میں نے آپ کو بالکل نہیں پہچانا۔ معاف کیجئے گا۔'' سید اولاد حسین نے جواب دیا۔'' حضور نواب صاحب! میں آپ کے خادم بخشو کا بیٹا غنیا ہوں''۔

''ایں۔'' اولاد حسین نے چونک کر تقریباً اچھلتے ہوئے کہا۔'' کیا کہا؟۔ تم بخشو کے بیٹے غنیا ہو؟''

''جی۔ غنی احمد نے جواب دیا۔

''پھر یہ میرے خاندان کے بزرگوں کی تصویریں۔'' اولاد حسین کچھ کہتے کہتے رک

گئے۔

''حضور نواب صاحب۔''جن بزرگوں کا نمک کھا کر آج میں اس مقام تک پہنچا ہوں ان کو کیسے بھول سکتا ہوں۔''

''واہ۔'' اولاد حسین کے منہ سے بے ساختہ نکلا ''نمک حلالی کی اعلیٰ مثال ہے''۔

''آپ لوگ تشریف رکھیں۔ میں ابھی آیا'' کہہ کر غنی احمد کوٹھی کے اندر چلے گئے۔

سید اولاد حسین نے اختر صاحب کی حیرت کو توڑا اور بولے۔

''خدا بخش جن کو ہم بخشو کے نام سے پکارتے تھے، ہمارے کوچوان تھے۔ تعلقداری کے زمانہ میں ہم اپنی نجی سواریوں پر چلتے تھے۔ دو گھوڑوں کی بگھی ہماری سواری تھی۔ ہم کبھی کرائے کی سواری سے نہیں چلے کیونکہ کرائے کی سواری پر چلنا اس زمانہ کے شرفا کے لیے معیوب تصور کیا جاتا تھا۔ بخشو ہمارے بہت ہی ایماندار، وفادار اور شریف خادم تھے۔ گھر کا ہر فرد ان کی عزت کرتا تھا اور ہم ان کو احترام سے مخاطب کرتے تھے۔ بچپن کے زمانہ میں ہماری چھوٹی چھوٹی شرارتوں پر وہ ہماری گوشمالی کرنے کا پورا اختیار رکھتے تھے۔ ہم سب بچے ان کی ڈانٹ کھا کر خوش ہوتے تھے۔ ان کا اکلوتا بیٹا غنی احمد تھا جسے ہم غنیا کے نام سے پکارتے تھے۔ غنیا میرا ہم عمر تھا لہٰذا وہ ہمارا دوست بھی تھا اور پتنگ بازی کا ساتھی بھی۔ ہم نے بچپن میں ساتھ ساتھ کنکوے اُڑائے اور کنچے کھیلے تھے۔ زمانہ کی گردش میں، ہم سب اپنے اپنے مسائل میں الجھ گئے۔ تعلقداری ختم ہو گئی اور شان و شوکت ایک قصہ پارینہ بن گئی۔ کسی کو کسی کی خبر نہ ملی۔ بس مجھے اتنا بتایا گیا کہ بخشو کا انتقال ہو گیا ہے اور غنیا نے امین آباد میں گھڑی مرمت کی دکان کھول لی ہے اس کے بعد اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔'' اولاد حسین اپنے ماضی کی داستان اختر صاحب کو سنا رہے تھے جن کی آنکھیں حیرت سے کھلی ہوئی تھیں۔ اتنے میں اندر کا دروازہ کھلا۔ غنی احمد، انکی بیگم اور ان کے پیچھے پیچھے کئی نوکر ہاتھوں میں بڑی بڑی سینیاں لیے برآمد ہوئے جسے انہوں نے چار بڑے سینٹر ٹیبل پر رکھ کر ادب کے ساتھ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ غنی احمد کی بیگم نے ادب و احترام سے سلام کیا اور بولیں۔

”حضور نواب صاحب۔“ انہوں نے سینیوں پر پڑے خوبصورت خوان پوش کو ہٹایا اور بولیں ”یہ کپڑے اور زیورات بیٹی نسرین کے لیے ہیں۔ آپ اسے قبول فرما کر ہمیں عزت بخشیں“۔

سید اولاد حسین نے غنی احمد کی بیگم کے اندازِ گفتگو سے ان کے اخلاق و محبت کا بخوبی اندازہ لگالیا اور حیرت سے سینیوں میں رکھے قیمتی ہیرے جواہرات کے بنے زیورات کو دیکھنے لگے۔ اعلیٰ قسم کے بے حد قیمتی ملبوسات دیکھ کر ان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بخشو کی اولاد کو عزت و شہرت کے اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا ہے۔

”آپ حضرات کی حیرت کو میں دور کیے دیتا ہوں“ غنی احمد بولے۔ انہوں نے اپنی داستان یوں بیان کی۔

امین آباد کی میری گھڑی مرمت کی دکان پر ایک دن فوج کا ایک اعلیٰ افسر اپنی فوجی وردی میں فوجی جیپ میں آیا اور اپنی گھڑی دکھاتے ہوئے بولا۔

”مستری صاحب۔ میں پونے سے لکھنؤ تبدیل ہو کر آیا ہوں۔ بہت قیمتی گھڑی ہے جسے میں سوئزرلینڈ سے لایا تھا۔ خراب ہو گئی ہے۔ پونا اور بمبئی کے اچھے سے اچھے کاریگر اسے ٹھیک کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ آپ اسے دیکھیں شاید اسے ٹھیک کر سکیں۔ لکھنؤ کا بڑا نام سنا ہے“۔

میں نے وہ گھڑی رکھ لی۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب گھڑیوں میں روزانہ صبح چابی بھری جاتی تھی۔ ان کے پرزوں کو صاف کر کے دوبارہ سیٹ کیا جاتا تھا۔ لہٰذا میں نے اس گھڑی کے تمام پرزوں کو اہتمام سے صاف کیا اور سیٹ کر دیا۔ اللہ کا کرم اور ہمارے بزرگوں کی دعاؤں سے وہ گھڑی ٹھیک ہو گئی اور صحیح وقت دینے لگی۔ اس مہربان فوجی افسر نے اپنی خوشی کا اظہار کیا اور ذاتی دلچسپی لے کر میرے لیے فوج میں ٹھیکیداری کا انتظام کر دیا، ٹینڈر پر ٹینڈر ملتے گئے اور میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔ اور پھر وہ دن آیا جب میں اپنے شہر کا سب سے بڑا فوجی

ٹھیکیدار بن گیا۔ دولت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے عزت سے بھی نوازا۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں آپ کے سامنے ہوں۔''

اتنا کہہ کر غنی احمد رک گئے اور کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ آخر انہوں نے خود اس سکوت کو یوں توڑا۔ ''نواب صاحب! نسرین بیٹا کو دے کر آپ ہم پر بہت بڑا احسان کریں گے۔ انشاء اللہ بیٹا کو زندگی میں کبھی تکلیف نہیں ہوگی۔

آپ کے بیٹے شبیر احمد انتہائی نیک اور شریف ہیں۔ وہ کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔

سید اولاد حسین نے اپنے دوست اور ہمراز اختر صاحب کی طرف دیکھا اختر صاحب نے حامی بھرنے کا اشارہ کیا اور آنکھوں ہی آنکھوں اشاروں کی زبان میں باتیں ہوئیں کہ غنی احمد کے ماضی سے صرف ہم اور آپ ہی واقف ہیں لہٰذا اس رشتہ کو قبول کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

''مجھے منظور ہے۔ شادی کی تاریخ جلد سے جلد طے کرلو''۔

سید اولاد حسین نے اپنا فیصلہ سنایا جس کو سن کر غنی احمد اوران کی بیگم خوشی سے پھولے نہیں سمائے کہ آج سے ہم بھی نجیب الطرفین کہلانے کے مستحق ہو گئے۔

......☆......

(ماہنامہ ''لاریب'' لکھنؤ۔ نومبر ۲۰۰۸ء)

پیلے ہاتھ

درگاہ کے باہر پڑی ایک ضعیف فقیر کی لاش کے چاروں طرف بھیڑ جمع ہوگئی تھی۔ کڑکڑاتی ٹھنڈک میں کالے کمبل میں لپٹی فقیر کی لاش کو پہچاننے والا کوئی نہیں تھا۔ بھیڑ میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کسی کا خیال تھا کہ بیچارہ ٹھنڈک سے مرگیا اور کسی کا نظریہ تھا کہ علالت کی وجہ سے انتقال کرگیا۔ مگر اس کی شناخت کرنے والا کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ ویسے بھی فقیروں کو کون پہچانتا ہے۔ ان کی صرف ایک پہچان ہوتی ہے بھیک مانگنے والے فقیر کی۔ درگاہ سے نکلنے والا ہر شخص خواہ وہ مرد ہو یا عورت، چند لمحے کے لئے اس گداگر کی لاش کے قریب رکتا، اور ایک نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ جاتا۔

عام طور پر درگاہ، مسجد، مندر اور گردوارہ کے آس پاس فقیروں کا ہمیشہ ایک جم غفیر لگا رہتا تھا۔ مسجدوں کے سامنے اللہ کے نام پر سوال کرنے والے فقیر آپ کو ہر جگہ نظر آجائیں گے۔ اکثر وہی فقیر کسی مندر کے سامنے بھگوان کے نام پر دان کی درخواست کرتا نظر آجائے گا۔ گداگری کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کے ہر مذہب میں دان دینے کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ دان دینے والے کو یہ فقیر سورگ میں جانے کی بشارت دیتے ہیں اور ہر شخص سورگ میں جانے کا خواہشمند ہے۔ اسلام نے آمدنی کے اخراجات سے پس انداز کی ہوئی رقم پر ڈھائی فیصد زکاۃ دینا فرض قرار دیا ہے۔ یہ ڈھائی فیصد ان غریب، مسکین، یتیم اور مالی طور پر کمزور افراد کو دینے کا حکم ہے جو پریشان حال ہیں۔

زکاۃ کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ دولت سمٹ کر محدود ہاتھوں میں ایک جگہ نہ رہ جائے۔ امیر اور زیادہ امیر نہ ہوتا جائے اور قوم کا کمزور طبقہ غربت کے غار میں نہ گرتا چلا جائے۔ زکاۃ ادا

کرنے کا واحد مقصد غریبوں کی غریبی دُور کرنا ہے تا کہ وہ بھی سماج میں عزت کی زندگی گزار سکیں۔ صدقہ اور خیرات کی بھی اسلام میں حوصلہ افزائی کی گئی ہے تا کہ کمزور طبقہ کی ضروریات پوری ہوسکیں۔ اسلام نے اس گھر کے افراد کا کھانا حرام قرار دے دیا ہے جس کا پڑوسی فاقہ کر رہا ہو۔

درگاہ کے احاطے میں مرنے والا فقیر بھی ان لاکھوں فقیروں میں سے تھا، جو پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ درگاہ کے باہر پڑی فقیر کی لاش کی شناخت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ہر فقیر تقریباً ایک جیسے لگتے ہیں۔ بڑھے ہوئے بال، بڑھی ہوئی بے ترتیب داڑھی، گندے کپڑے پہنے اپنے لمبے لمبے ناخونوں سے بدن کو کھجلاتے ہوئے فقیر ہر جگہ دکھائی دے جائیں گے۔ ان کے اثاثہ میں ایک میلی کالی گٹھری ہوتی ہے جسے چھوتے ہوئے بھی گھن آتی ہے۔ کسی کسی فقیر کے پاس پھٹا پرانا کالا بیگ بھی نظر آ جائے گا جس کی جیبوں میں کھانے کی اشیاء کے علاوہ روز کی آمدنی کی رقم رہتی ہے۔

ایسا ہی تھا وہ فقیر، جس کی لاش درگاہ کے باہر پڑی ہوئی تھی۔ درگاہ پر تعینات پولیس کا ایک سپاہی ڈنڈا گھماتے ہوئے اس فقیر کی لاش کے قریب آیا۔ لاش کو غور سے دیکھا۔ چہرہ پر پڑی گندی چادر کو اس نے اپنے ڈنڈے سے ہٹا کر اس کے چہرے کا معائنہ کیا اور تماشہ دیکھنے والوں کی بھیڑ کو للکارتے ہوئے پوچھا۔

”کوئی اس فقیر کو پہچانتا ہے“؟

”نہیں صاحب......“ کئی آوازیں ایک ساتھ آئیں۔

”کیسے نہیں پہچانتے......“؟ سپاہی اور زیادہ کڑک کر بولا۔

”تم لوگ روز یہاں آتے ہو۔ پھول خریدتے ہوئے۔ چڑھانے کے لئے چادر خریدتے ہو۔ فقیروں کو دان دیتے ہو اور کہتے ہو کہ ہم اسے نہیں پہچانتے“۔

”دیوان جی......“ ایک مہذب شخص نے شستہ لہجہ میں سپاہی کو مخاطب ہو کر کہا......

”دیوان جی......درگاہ کے زائرین زیارت کر کے چلے جاتے ہیں۔ بھلا ہم اسے کیسے پہچان سکتے

ہیں''۔

''دیکھو میاں جی......'' سپاہی نے کہا...... اس مرنے والے فقیر کا چہرہ مجھے دوسرے فقیروں سے تھوڑا الگ لگ رہا ہے۔ اس لئے مجھے تھوڑی چنتا ہے کہ آخر یہ کون ہے، کہاں سے آیا اور یہاں مرگیا''؟

''دیوان جی'' اس شخص نے کہا...... ''آپ بجا فرماتے ہیں۔ یہ تو آپ کی شرافت اور انسان دوستی ہے کہ آپ ایک فقیر کی لاش کے لئے اتنے فکرمند ہیں......''

''دیکھو میاں......'' سپاہی نے کہا...... ''ہم بھی انسان ہیں اور ہمارے سینے میں بھی ایک دل ہے جو دھڑکتا ہے۔ یہاں روز کوئی نہ کوئی مرتا ہے اور ہم اسے لاوارث گھوشت کرکے پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دیتے ہیں...... مگر......'' اتنا کہہ کر وہ رُک گیا۔

''مگر کیا دیوان جی'' ...... اس شخص نے دلچسپی لیتے ہوئے پولیس کے اس سپاہی سے پوچھا۔

''مگر میری انتر آتما کہتی ہے کہ یہ فقیر دوسرے فقیروں کی طرح کیوں نہیں ہے۔ اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی راز کی بات ہے جو میرے دل کو پریشان کررہی ہے'' ...... سپاہی نے کہا۔

''پھر...... آپ کیا کریں گے دیوان جی'' ...... اس شخص نے پوچھا۔

''میں اپنے انسپکٹر انچارج سے بات کروں گا...... مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو۔ نکلو یہاں سے...... بھاگو، ورنہ اُٹھا کر بند کردوں گا''۔

''جی اچھا حضور'' ...... کہہ کر وہ شخص ڈر سے کانپتا ہوا وہاں سے جلدی سے کھسک گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ دیوان جی پر اب پولسیا رعب طاری ہوگیا ہے۔ بھاگ لینے میں ہی عافیت ہے ورنہ ان پولیس والوں کا کیا ٹھکانہ، پتہ نہیں کس جرم میں بند کردیں۔

سپاہی اپنی پولیس چوکی پر پہنچا اور کمرے میں بیٹھے اپنے باس انسپکٹر ذکی احمد کو بڑا لمبا سیلوٹ کیا۔

''کیا بات ہے امر سنگھ'' انسپکٹر ذکی احمد نے سپاہی امر سنگھ سے پوچھا..... ''آج تم کچھ فکر مند نظر آ رہے ہو، خیریت تو ہے''؟

''سر..... درگاہ سے آ رہا ہوں..... وہاں ایک فقیر کی لاش پڑی ہے''۔ سپاہی نے اپنے انچارج کو فقیر کی لاش کی اطلاع دی۔

''تو اس میں اتنا فکر مند ہونے کی کیا بات ہے''۔ انسپکٹر احمد نے کہا۔

''بھئی یہ درگاہ ہے جہاں درجنوں فقیر بھیک مانگنے کے لئے بیٹھے رہتے ہیں، جن میں زیادہ تر بوڑھے ہوتے ہیں، اگر ان میں سے ایک مر گیا تو تم کو اتنا دُکھ کیوں ہے''؟

''حضور..... دُکھ کی بات یہ ہے کہ میں نے شناخت کے لئے اپنے ڈنڈے سے جب اس کا چہرہ کھولا تو مجھے وہ پیشہ ور فقیر نہیں لگا۔ میری انتر آتما نے کہا سر..... کہ یہ کوئی مجبور اور پریشان حال آدمی ہے جو درگاہ پر مر گیا''..... سپاہی نے اپنے دل کی بات کو اپنے انچارج سے کچھ اس انداز سے کہی کہ ان کو بھی فقیر کی لاش سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ انہوں نے سپاہی سے کہا۔

''امر سنگھ..... تم نے تو ایسی بات کہہ دی ہے کہ اب مجھے خود معائنہ کرنا پڑے گا..... ڈائری لاؤ..... انٹری کر دوں''۔ انسپکٹر نے سپاہی امر سنگھ سے کہا اور اپنی سرکاری کیپ سر پر رکھ کر سپاہی کے ساتھ تھانہ سے نکل گئے۔ درگاہ میں پڑی فقیر کی لاش کے اِرد گرد ابھی بھی کافی بھیڑ تھی۔ لحیم شحیم شخصیت کے مالک تھانہ انچارج ذکی احمد کو درگاہ کی طرف جاتے دیکھ کر بہت سے لوگ ان کے پیچھے پیچھے لگ گئے۔ انسپکٹر ذکی احمد نے ایک دوسرے سپاہی سے پوچھا جس کی ڈیوٹی درگاہ پر تھی۔

''کچھ پتہ چلا کہ یہ فقیر کہاں رہتا تھا''؟

''نہیں حضور..... کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے''۔ سپاہی نے جواب دیا۔

''تم نے دوسرے فقیروں سے اس کے بارے میں معلوم کیا ہے''؟

''ہاں صاحب..... دوسرے فقیر بتاتے ہیں کہ مرنے والا فقیر کسی سے بات تک نہیں

کرتا تھا۔ پتہ نہیں کیا سوچتا رہتا تھا''۔

انسپکٹر ذکی احمد نے لاش کو ایک چبوترے پر رکھوا کر حکم دیا کہ اس کا بیگ اٹھالاؤ۔ لہٰذا دونوں سپاہی اس فقیر کے پھٹے پرانے بیگ کو لے کر صاحب کے سامنے آگئے۔ ایک سپاہی کی فقیر کی لاش کے پاس ڈیوٹی لگا کر سپاہی امر سنگھ کو حکم دیا کہ فقیر کا بیگ لے کر تھانہ پہنچو۔ سپاہی امر سنگھ جب بیگ لے کر تھانہ آیا تو انسپکٹر نے حکم دیا کہ اس کو کھولو۔ تھوڑی ہچکچاہٹ اور بیگ کی گندگی کی وجہ سے سپاہی تھوڑا جھجکا، جسے انسپکٹر نے محسوس کیا۔

''امر سنگھ...... گھبراؤ مت...... کھولو...... دیکھا جائے کہ اس میں کیا ہے۔ شاید مرنے والے کا کچھ پتہ چل سکے''۔ انسپکٹر ذکی احمد نے سپاہی امر سنگھ سے کہا۔

''جی صاحب......'' کہہ کر سپاہی نے بیگ کے اندر رکھا ایک ایک سامان نکالنا شروع کیا۔ سب غیر ضروری سامان تھا اور اس کے ساتھ ڈاک خانہ کے بہت سے پوسٹ کارڈ نکلے جو سب اُردو زبان میں لکھے ہوئے تھے۔ پوسٹ کارڈ کا پورا پیکٹ سپاہی نے اپنے انسپکٹر ذکی احمد کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد وہ دیگر سامان کی تلاشی لینے لگا۔ انسپکٹر ذکی احمد ایک ایک پوسٹ کارڈ کو بغور پڑھنے لگے۔ کافی چھان بین کرنے کے بعد سپاہی امر سنگھ کو بیگ سے مزید کچھ حاصل نہیں ہوا۔

''حضور......'' سپاہی نے انسپکٹر احمد کو مخاطب کر کے کہا۔

''کچھ پھٹے پرانے کپڑوں کے علاوہ کوئی ضروری چیز نہیں ملی''۔

''روپے...... کیا روپیہ بھی نہیں ملا اُمر سنگھ''۔ انسپکٹر نے پوچھا۔

''نہیں صاحب...... روپیہ تو نہیں ہے۔ کیا پوسٹ کارڈ میں کچھ لکھا ہے کیا صاحب''۔ امر سنگھ نے پوچھا۔

''امر سنگھ......'' انسپکٹر ذکی احمد نے کہنا شروع کیا۔

''تم نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ پیشہ ور فقیر نہیں لگ رہا ہے۔ اسی لئے تم کچھ پریشان تھے''۔

''تب پھر وہ کون تھا صاحب''۔

خطوں کو پڑھنے سے یہ پتہ چلا کہ تمہارے پردیس کا رہنے والا محمد ستار نامی آدمی اس شہر میں پچھلے چالیس سالوں سے رکشہ چلا رہا تھا۔ مگر'' انسپکٹر اتنا کہہ کر رُک گئے اور پھر بولے...... 'مگر جیسا کہ اس نے اپنی بیوی سلمہ کو لکھا تھا کہ اب مجھ سے رکشہ نہیں چلایا جاتا۔ بہت کمزور ہو گیا ہوں۔ اس لئے میں نے دوسرا کام شروع کر دیا ہے جس میں محنت کم ہے اور آمدنی زیادہ ہے''۔

''اور کیا لکھا ہے صاحب''...... سپاہی امر سنگھ کی دلچسپی اس لئے اور بڑھ گئی کہ مرنے والا فقیر رکشہ والا ستار اس کے صوبہ سے تعلق رکھتا تھا۔

''لکھا ہے......'' انسپکٹر ذکی احمد نے ایک خط اُٹھا کر پڑھنا شروع کیا اور ختم کر کے سپاہی امر سنگھ سے مخاطب ہوئے۔

''امر سنگھ''

''جی......سرکار''

''ستار رکشہ والے کے خط کے جواب میں اس کی بیوی سلمہ نے لکھا کہ خدا کے لئے تم کوئی غیر قانونی کام نہ کرنا۔ تمہاری بیٹی نجمہ اب پندرہ سال کی ہو گئی ہے اور جب تک اس کے ہونے والے سسرال والوں کو اسی ہزار کی موٹر سائیکل اور جہیز نہیں ملے گا وہ شادی نہیں کریں گے۔ پوری شادی میں کم سے کم دو لاکھ روپیہ کا خرچہ ہے''۔

''ہائے رام......'' سپاہی امر سنگھ یہ سن کر روہانسا ہو گیا۔

''بیچارہ...... رکشہ والا کہاں سے دو لاکھ اکٹھا کرتا۔ آخر مر گیا''۔

''نہیں امر سنگھ''۔ انسپکٹر ذکی احمد نے سپاہی سے کہا۔

''تم اس کے بیگ کو نیچے سے پھاڑو...... اس میں تم کو ایک لاکھ نوے ہزار روپے ملیں گے''۔

سپاہی نے جلدی جلدی بیگ کو پھاڑنا شروع کیا۔ بیگ کے نچلے حصہ میں اس کو ہزار اور

پانچ سو کے بے انتہا نوٹ ملے، جس کو اس نے انسپکٹر صاحب کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

''گنو...... کاؤنٹ کرو......'' انسپکٹر نے حکم دیا جس پر سپاہی نے فوراً عمل شروع کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد سپاہی نے کہا۔

''حضور...... آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ اس میں ایک لاکھ نوے ہزار روپے ہیں۔ بالکل اتنے ہی نکلے ہیں سرکار''۔ سپاہی نے کہا۔

''امر سنگھ...... ستار رکشہ والے کے خط کے جواب میں اس کی بیوی سلمہ نے لکھا کہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم نے ایک لاکھ نوے ہزار جمع کر لیا ہے۔ اب دس ہزار کی کمی ہے۔ تم جلد آ ؤ اور اپنی چہیتی بیٹی نجمہ کے ہاتھ پیلے کر دو''۔

''صاحب'' امر سنگھ نے کہا ''صاحب بڑی دردبھری کہانی ہے۔ مجھے مت سنائیے ورنہ میں رونے لگوں گا۔ اس کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔ انسپکٹر ذکی احمد اس کے اس جذبہ سے بیحد متاثر ہوئے اور پوچھا...... ''تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے''۔

''حضور...... میری بھی ایک جوان بہن ہے۔ ماں باپ بوڑھے ہیں...... میں اپنی بہن کی شادی کے لئے روپے جمع کر رہا ہوں۔ اسی لئے میں تھوڑا پریشان ہو گیا۔ معاف کر دیجئے''۔ سپاہی نے کہا۔

''نہیں نہیں...... کوئی بات نہیں۔ اب تم ایسا کرو کہ ستار فقیر کی لاش کو ٹھنڈے گھر میں رکھوا دو اور میں اس کی بیوی اور بیٹی کو بلانے کا وہاں کی پولیس کے ذریعہ انتظام کرتا ہوں''۔ انسپکٹر ذکی احمد نے کہا۔

''بہت اچھا حضور......'' کہہ کر سپاہی چلا گیا۔

''پولیس انسپکٹر ذکی احمد نے فقیر ستار کی بیوی اور بیٹی کو بلا کر پورا حال بتایا۔ تجہیز و تکفین کا انتظام کیا اور دو لاکھ روپیہ ستار مرحوم کی بیوی سلمہ کو دیا کہ گاؤں جا کر بیٹی نجمہ کی شادی کر دو۔ اگر چھٹی ملی تو میں بھی آؤں گا''۔

انسپکٹر ذکی احمد نے ایک لاکھ نوے ہزار میں اپنی جیب سے دس ہزار روپے ملا کر سلمہ کو دو لاکھ روپے دیئے جس کا وعدہ مرحوم ستار نے اپنے بیوی بچوں سے کیا تھا۔

افسوس کہ ستار اپنے ہاتھوں سے اپنی اکلوتی بیٹی نجمہ کے ہاتھ پیلے نہ کر سکا اور اس دُنیا سے کوچ کر گیا۔

......☆......

نوگل

مہہ جبیں کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی چہیتی بھابی زینت کوثر ایسی بات کہہ دیں گی جو ٹھیک اس کے دل کو چیرتی ہوئی نکل جائے گی۔ اس نے سوچا کہ بھابی تو میری سب سے قریبی رازدار وغمگسار دوست اور سہیلی ہیں۔ اسی خیال سے اس نے سوچا کہ سب سے پہلے بھابی کو ہی اطلاع دینا مناسب ہوگا۔ مگر زینت بھابی کی یہ سوچ ہوگی اس نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔ اس نے پچھلے کئی سالوں کے واقعات کا محاسبہ کیا کہ کہیں کوئی ایسی غلطی اس سے سرزد ہوگئی ہو جو بھابی کی اس بے اعتنائی کی وجہ بنی ہو، مگر ذہن پر لاکھ زور دینے کے باوجود سمجھنے سے قاصر تھی کہ اچانک بھابی کا اخلاق ومحبت بھرا برتاؤ نفرت میں کیسے تبدیل ہوگیا۔ جو بات انہوں نے کہی تھی وہ تو کوئی دشمن سے بھی نہیں کہتا، پھر بھابی نے کیوں کہا؟ وہ تھوڑی دیر کے لئے ماضی کی یادوں میں کھوگئی۔

''آخر آپ اپنے بھائی کے لئے کیسی لڑکی کی تلاش کررہی ہیں''۔ لکھنؤ کی روایتی شادیاں لگانے والی نے پوچھا جن کو مشاطر کہا جاتا تھا۔ مہہ جبیں سے سوال کیا۔

''ایک اچھی لڑکی'' اس نے مختصر جواب دیا''۔

''اچھی لڑکی سے آپ کی کیا مراد ہے۔ کیا وہ آپ ہی کی طرح خوبصورت ہو''۔

نہیں۔ میں اپنے بھائی کے لئے خوبصورت نہیں خوب سیرت کی تلاش کررہی ہوں۔

''تو آپ کو کوئی ایسی لڑکی ملی''؟

''نہیں، ابھی تک تو نہیں ملی''۔ مہہ جبیں نے جواب دیا۔

''ملے گی بھی کیسے؟ صورت تو انسان دیکھ سکتا ہے مگر سیرت کا کیسے پتہ چلے گا''۔

''پتہ چلے گا'' مہہ جبیں نے دعویٰ کے ساتھ کہا۔

''کیسے......''؟

اگرلڑکی کے گھر کا ماحول اچھا ہے۔ اس کے والدین میں دینداری اور خدا کا خوف ہے۔ حقوق العباد کا خیال ہے تو اس گھر کی لڑکی کی سیرت اچھی ہوگی۔ اس نے کہا۔

اور اگر لڑکی کے دادا دادی حیات ہیں اور ساتھ رہتے ہیں تو ایسے ماحول کی پروردہ لڑکی میں بزرگوں کی خدمت کا جذبہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی سیرت اچھی ہوگی۔

''اگر نہ رہتے ہوں تو''۔

''تب سوچنا پڑے گا۔ وجہ یہ ہے کہ جن والدین نے خود اپنے والدین کی خدمت نہ کی ہو، اس کی اولاد سے خدمت کی اُمید فضول ہے''۔ مہہ جبیں نے کہا۔

''مگر یہ تو کوئی اصول نہیں ہے۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں جنہوں نے کسی وجہ سے اپنے والدین کی جیسی خدمت کے وہ مستحق تھے خدمت نہیں کی مگر خود ان کی اولاد نے ان کی غیر معمولی اور مثالی خدمت انجام دی ہے''۔

''ہاں، ایسا بھی ہوتا ہے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے''۔ مہہ جبیں نے کہا۔

پھر، پوچھا گیا۔

بیٹا ایک بات پوچھوں، برا نہ ماننا۔

ہاں ہاں پوچھئے۔

''آپ بڑی فلسفیانہ باتیں کرتی ہیں۔ آپ کہاں پڑھتی ہیں''۔

''خالہ میں یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں اور آپ کا خیال درست ہے۔ میں فلسفہ میں ایم۔ اے۔ کر رہی ہوں''۔

''میں تو ایک اصول کی بات کر رہی تھی۔ کبھی کبھی بااصول حضرات سے بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں، کیونکہ وہ بھی انسان ہیں اور انسان غلطیوں کا پتلا ہے''۔ مہہ جبیں نے کہا۔

مہہ جبیں خیالوں کی دُنیا سے واپس لوٹ آئی اور سوچنے لگی کہ جس بھابی کی تلاش میں، میں نے شہروں کی خاک چھانی، امی جان کے ساتھ جگہ جگہ لڑکی دیکھنے گئی، طرح طرح کی پریشانیاں اٹھائیں، کبھی کالج سے چھٹی لی تو کبھی کلاس ہی اٹینڈ نہیں کئے۔ اپنے کیریئر کو داؤں پر لگا دیا، وہ بھابی کیسے اتنی بڑی بات کہہ سکتی ہیں۔ اس کو یقین نہیں ہو رہا تھا کہ یہ ساری باتیں اس سے اس کی بھابی نے ہی کہی ہیں۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا انسان بلا کسی وجہ بھی بدل جاتا ہے۔ اس کی بھابی تو ایک دیندار گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ پنج وقتہ نماز کی عادی، پردے کی پابند۔ ان کے خاندان میں کسی نے دس سال سے زیادہ عمر کی لڑکی کو بغیر حجاب نہیں دیکھا تھا۔ ہر جمعہ کو مستورات کا گھر پر اجتماع، ملک کے علماء کی تقاریر کا سلسلہ، درس اور حدیث کا بیان۔ یہ وہ خصوصیات تھیں جن کے درمیان اس کی بھابی زینت کوثر کی پرورش ہوئی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے اللہ کا ذکر اور سنتوں پر عمل کی تلقین۔ مہہ جبیں نے سوچا کہ ایسے دینی ماحول کی پروردہ بھابی نے ایسی بات کیوں کہی؟ کوئی تو بات ہوگی۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے پھر خیالوں میں گم ہوگئی۔

تمہارے سپنوں کے شہزادے کو ہم آج دیکھ آئے ہیں۔ مہہ جبیں کو اس کی بھابی نے چھیڑا۔ ''بھابی'' مہہ جبیں نے شرما کر کہا۔

اب شرماؤ نہیں۔ ''دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے یہ سن کر کہ خوابوں کا شہزادہ امریکہ میں رہتا ہے''۔ زینت نے کہا۔

''بھابی۔ آج آپ نے طے کرلیا ہے کہ مجھے پریشان کریں گی''۔

پریشان نہیں کر رہی ہوں بنو، میں تو تم کو یہ بتا رہی ہوں کہ ماشاء اللہ تمہارے ہونے والے کی کیا پرسنالٹی ہے۔ واہ لمبا قد، گورا رنگ، اعلیٰ تعلیم، اب کیا چاہئے۔ زینت نے اپنی نند مہہ جبیں کو چھیڑا۔

''اور۔ اور''۔ مہہ جبیں نے شرارت سے پوچھا۔

اور۔ اور کیا، پوچھ رہے تھے کہ ایم اے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنی ہے

یا یونائیٹڈ اسٹیٹ کی یونیورسٹی سے۔ اتنا کہہ کر زینت چند لمحوں کے لئے رک کر مہہ جبیں کے چہرے کے تاثرات دیکھنے لگی۔

کیا کہا آپ نے، بھابی۔

میں نے کہہ دیا کہ لکھنؤ سے۔ زینت کوثر نے اتنا ہی کہا تھا کہ مہہ جبیں نے اپنی پیاری بھابی زینت کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور دھیرے سے کہا۔

''لکھنؤ نہیں، یو ایس کی کسی یونیورسٹی سے''۔

''اچھا جناب تو پروگرام بن چکا ہے اور مجھے بیوقوف بنایا جا رہا ہے''۔ زینت نے کہا۔

زمانہ تیزی سے گزرتا رہا اور ماضی کی طرف جھانکنے کی بھی کسی کو فرصت نہیں رہی۔ مہہ جبیں نے فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی۔ کچھ سالوں تک امریکہ ہی میں رہی اور درس و تدریس کا باعزت اور شریفانہ پیشہ اختیار کر لیا۔ اس کا شوہر سائنٹسٹ تھا۔ لہٰذا مراد کی زندگی گھر اور لیب کے درمیان گزر رہی تھی کہ نوگل کی آمد متوقع ہوگئی۔ اب روز کے معمول میں بھی تبدیلی آنے لگی۔

''بھئی مبارک ہو''۔ مراد نے مہہ جبیں کو چھیڑا۔

''کیسی مبارک باد''؟ مہہ جبیں نے دریافت کیا۔

تم سے پہلے مجھے لیب میں ڈاکٹر ماریہ ایستھ نے بتایا۔ تو تمہارے گھر کا کام تو آنے والی نوگل کر دے گی۔ کالج کے کلاسز ڈسٹرب نہیں ہوں گے۔

''نوگل، مراد تم نے پیارا نام تجویز کیا ہے اور اگر لڑکا ہوا تو کیا رجسٹرڈ کرایا جائے گا''۔ مہہ جبیں نے کہا ''نامراد'' مراد نے مذاق کیا۔ خدا نہ کرے آپ اچھے ہیں تو ماشاء اللہ بیٹا بھی اچھا ہوگا۔

''میری ڈیوٹی ہوگی بے بی سینٹر میں لٹا کر سڑک پر گھمانا پھرانا''۔ مراد نے کہا۔

''اچھا تو کیا مفت کے ڈیڈی کہلائیں گے''۔ مہہ جبیں نے چھیڑا۔

مراد۔ کیا ڈاکٹر ماریہ نے تم کو بھی کوئی مشورہ دیا تھا جو اس نے مجھے دیا تھا۔ مہہ جبیں نے

پوچھا۔

ہاں، اس نے جواب دیا، مگر میں نے اس کی بات ایک کان سے سنی اور دوسرے کان سے نکال دی۔ کیونکہ مجھے بچے بیحد پسند ہیں۔

''اور میں'' مہہ جبیں نے برجستہ پوچھا۔

تمہارا تو کوئی جواب نہیں ہے، کہہ کر مراد آگے بڑھا، مگر مہہ جبیں نے روک دیا۔

''لیکن سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ میری پرگ نینسی سے وہ کیوں پریشان ہے''۔

مجھ سے انہوں نے صاف صاف کہا کہ ٹرمینیٹ کرادو۔ مہہ جبیں بہت اچھی اور کم عمر لڑکی ہے، بچہ کی دیکھ ریکھ کرنا اس کے لئے مشکل ہوگا۔

تم نے ڈاکٹر ماریہ کو کیا جواب دیا۔ وہ بتاؤ، مہہ جبیں نے پوچھا۔

ڈارلنگ۔ میں نے بھی صاف صاف کہہ دیا کہ مہہ جبیں بہت ہمتی لڑکی ہے۔ تم نہیں سمجھوگی۔

ماریہ! جب وہ میرے جیسے نالائق کی پرورش کر رہی ہے تو پھر آنے والی مہمان کی تو اور زیادہ خاطر تواضع ہوگی۔ مراد نے مہہ جبیں کو خوش کر دیا، لیکن ڈاکٹر ماریہ ایسا کیوں چاہتی تھی۔ مہہ جبیں نے پوچھا۔

بھئی اس میں نئی کیا بات ہے۔ یہاں انگلینڈ اور کناڈا میں لڑکیوں کی اچھی حالت نہیں ہے۔ اسلام ہی وہ دُنیا کا پہلا مذہب ہے جس نے لڑکیوں کو عزت بخشی ہے۔ لڑکی کے بارے میں تو ہمارے رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی شہادت کی اُنگلی کو دوسری اُنگلی سے ملا کر اعلان کیا کہ جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی، بالغہ ہونے پر اس کا نکاح کر دیا وہ جنت میں میرے ساتھ ہوں گے۔

ایک صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔ اگر کسی کے صرف ایک بیٹی ہی ہو تو؟ جواب میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ بھی۔ دراصل یورپی ملکوں میں کھلا

سماج ہے۔لہذا بارہ سال کی عمر میں لڑکی کنواری ماں بن جاتی ہے۔

نوگل کی آمد سے گھر میں رونق آ گئی۔ گورے گورے سرخ وسفید، کالے بال اور ننھی منی پیاری پیاری انگلیوں کو دیکھ کر مہہ جبیں خوشی سے جھوم اٹھی۔ بہت خوبصورت بچی پیدا ہوئی تھی۔ اسپتال کی وہ نرس جو مہہ جبیں کو اٹینڈ کر رہی تھی بولی "ماچی، سی اٹس لانگ فنگرس، شی ول بی ان فیوچر اے گڈ پیانو پلیئر"۔وہ کہہ رہی تھی کہ اس کی لمبی لمبی انگلیوں کو دیکھو۔ مستقبل میں یہ ایک بہت مشہور پیانو ماسٹر ہوگی۔امریکہ میں لمبی اُنگلیوں کو دھیان سے دیکھا جا رہا تھا اور اسلامی طریقے کے مطابق نوگل کے کانوں میں اس کے ڈیڈی مراد اذان دے رہے تھے جسے سبھی گورے مریض بڑے غور سے سن رہے تھے۔

نوگل جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھی مہہ جبیں کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔وہ اس کھلے ماحول میں مخلوط تعلیم کی قائل نہیں تھی۔وہ لکھنؤ میں ایم اے تک لڑکیوں کے سب سے اچھے اور معیاری کالج سے فارغ ہوئی تھی، جس کے گیٹ پر امیروں کے نوجوان نالائق اور عاشق مزاج لڑکے کالج کی چھٹیوں کے وقت باقاعدگی سے ڈیوٹی دیتے تھے۔جب تک آخری لڑکی اپنے گھر کو روانہ نہ ہو جاتی، گیٹ نہیں چھوڑتے تھے۔مگر کسی قسم کی بدتمیزی نہیں کرتے تھے۔مہہ جبیں اپنے کالج کے زمانہ میں یہ سارے منظر دیکھ چکی تھی، مگر یورپ کے نوجوانوں کو اتنی فرصت نہیں ہے کہ کسی کے پیچھے دوڑیں۔ بلوغت سے قبل ہی ایک دوسرے کے ہونٹوں کو چوس ڈالتے ہیں۔اپنے ملک میں تو بیجو آم بھی اتنی بے رحمی سے نہیں چوسا جاتا۔لہذا مہہ جبیں نے اچانک ایک غیر معمولی فیصلہ کیا اور مراد کو مطلع کر دیا۔

زلزلے کے جھٹکے سے جو انسان کی کیفیت ہوتی ہے جب وہ غیر یقینی کا اچانک شکار ہو جاتا ہے۔مراد کے مطابق یہ بھی اس زلزلے سے کسی طرح کم نہیں تھا۔مگر اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔مراد نے کہا بھئی امریکہ میں دو دو ہماری اور تمہاری نوکری چھوڑ کر واپس انڈیا جانا عقلمندی کا فیصلہ نہیں ہے۔انڈیا میں جاب کی بہت کمی ہے۔مگر مہہ جبیں اپنے شفٹ ہونے کے

فیصلہ سے ایک قدم پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔

مہہ جبیں نے کہا" یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ انڈیا میں جاب کی کمی ہے۔ اس لئے ہم وہاں جا کر بیکار گھومیں گے"۔" پھر اور کیا کریں گے"۔تم بتاؤ مراد نے پوچھا۔

مراد۔تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ امریکہ میں بھی جاب کی کمی ہے۔تم خود دو بار لے آف (چھٹنی) کے شکار ہو چکے ہو۔ دیکھو انڈیا کو اگلے بیس سالوں تک لاکھوں ٹیچروں کی ضرورت پڑے گی۔ اب ہر بڑے شہر میں یونیورسٹی قائم ہو رہی ہے۔ میں اپنی جاب کے لئے بالکل فکرمند نہیں ہوں اور کیا تم سمجھ رہے ہو کہ بغیر سائنس کے کوئی ملک ترقی یافتہ کہلا سکتا ہے۔ مہہ جبیں نے ایسا فلسفہ بیان کیا کہ مراد میاں کی بولتی بند ہو گئی۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ انڈیا بہت تیزی سے ڈیولپ ہو رہا ہے۔ مہہ جبیں سے وہ اس لئے گفتگو سے پرہیز کرتا ہے کہ وہ اپنے مضمون فلسفہ سے فائدہ اٹھا کر اسے خاموش کر دیتی ہے۔

لہٰذا دہلی آتے ہی یونیورسٹی میں مہہ جبیں کو اور وزارت سائنس اینڈ ٹکنالوجی میں مراد کو جاب مل گئی اور زندگی دوبارہ سکون سے چلنے لگی۔ مسرت کا مقام یہ تھا کہ یہاں اس کی سب سے چہیتی بھابی زینت کوثر رہتی تھیں جن سے دن میں چار پانچ بار فون پر بات ہو جاتی تھی۔ ایک دن اس نے بھابی کو خوشخبری سنائی کہ نوگل کے بعد دوسرے گل کی آمد ہے۔ یہ بات اس نے مراد کو بھی نہیں بتائی تھی۔

" یہ کیا غضب کر دیا تم نے مہہ جبیں"۔ زینت کوثر نے تعجب سے پوچھا۔" بھابی، اس میں تعجب اور چونکنے والی کون سی بات ہے"۔ مہہ جبیں نے کہا۔

" ہے۔اس مہنگائی کے زمانہ میں بچہ پیدا کرنا آسان نہیں ہے۔ یہاں تو بغیر ضرورت آپریشن کر دیتے ہیں تا کہ این آر آئی سے دو چار لاکھ روپے چوس سکیں۔ کوثر نے کہا، تو کیا ہوا۔ دے دیں گے۔ مہہ جبیں نے پوچھا۔تو پھر آپ مجھے رائے دیجئے کہ ہم کیا کریں۔

" دیکھو مہہ جبیں۔صرف پیدائش کا معاملہ نہیں ہے۔ اسکولوں کی فیس ہزاروں میں اور

ڈونیشن لاکھوں میں چل رہا ہے۔ ’’پھر بتایئے کہ میں کیا کروں‘‘۔ مہہ جبیں نے پوچھا۔
جواب زلزلہ کے ساتھ سنامی بھی ساتھ لایا۔ ’’دیکھو مہہ جبیں میری رائے کہ اسے ابورٹ کرادو۔ کیا کہا بھابی آپ نے کہ میں ابارشن کرادوں، اس ڈر سے کہ ہم اسے کہاں سے کھلائیں گے۔ لاحول پڑھیے۔ بھابی یہ سراسر غیر اسلامی عمل ہے۔ یہی وہ بات تھی جو اس کے دل کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ کیونکہ بھابی کا ایک انتہائی پریکٹکل دیندار خاندان سے تعلق تھا۔

......☆......

(روزنامہ ’’انقلاب‘‘ دہلی۔ ۹؍ستمبر ۲۰۱۲ء)

مہر

علی اکبر نے جب اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی سے دوسرا نکاح کیا تو کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ زمانۂ زمین داری میں ایسی شادیوں کو معیوب تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ زمین داری کو ختم ہوئے کچھ ہی دن گزرے تھے، ماضی کے سنہرے دنوں کی یاد تازہ تھی۔ لہٰذا کسی نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ حتیٰ کہ ان کے صاحبزادے علی امیر نے بھی کسی طرح کی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ جن کی نئی امی جان ان کی بیگم کی ہم عمر تھیں۔

علی اکبر اب نام کے نواب رہ گئے تھے۔ ان کے آبا و اجداد کو تعلق دار سے زمین دار بنے ایک زمانہ گزر گیا تھا۔ ڈیڑھ سو برس تک انگریزوں سے جنگ کرنے کے بعد جب آزادی نصیب ہوئی اور ملک آزاد ہوا تو جو سب سے بڑا کام انجام دیا گیا وہ تھا خاتمہ زمینداری...... چونکہ ۹۰ فیصد زمین داری مسلمانوں کے پاس تھی۔ لہٰذا زمین داری کے خاتمے کے بعد ملک کے بڑے بڑے زمین دار سڑکوں پر آ گئے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب اودھ اور خصوصاً لکھنؤ کی ایک عجیب اور نرالی شان ہوا کرتی تھی۔ ہر شخص خود کو نواب سے کم تصور نہیں کرتا تھا۔ نواب کہلوانے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ کیا امیر اور کیا غریب، ہر شخص ماضی کی حسین یادوں کو سینے سے لگائے جی رہا تھا۔ ماضی کے سنہرے دنوں کو کبھی اپنے وجود سے جدا ہونے نہیں دیا۔ امین آباد کے بازار میں اکثر ایک فقیر کی یہ صدا سنائی دیتی تھی کہ خدا کے نام پر چار آنے دے دو۔ دو دِنوں سے بالائی نہیں کھائی ہے۔

زمین داری چلی گئی تھی، مگر ذہنیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اچھا کھانا، بہترین لباس اور اعلیٰ رہائش کے عادی زمین دار حضرات آسائش کی تمام سہولتیں گھر کی قیمتی اور نایاب

اشیاء کوڑیوں کے مول فروخت کر کے حاصل کرنے لگے۔ موجودہ حالات سے سمجھوتہ کرنے پر قطعی تیار نہیں تھے۔ اسی زمانہ میں نام کے نواب علی اکبر دوسری بیگم کو اپنی آبائی کوٹھی 'نشیمن' میں شادی کر کے لے آئے۔

''بیگم حالات بدل گئے ہیں۔ میں حتیٰ الامکان آپ کو آرام پہنچانے کی کوشش کروں گا''۔ علی اکبر نے اپنی نئی نویلی دلہن شکیلہ بیگم سے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ کی محبت میرے لئے سب کچھ ہے، نواب صاحب''۔ شکیلہ بیگم نے آہستہ سے کہا۔

''بھئی آپ مجھے نواب صاحب نہ کہیں۔ کیونکہ اب ہم نہ نواب نہ تعلق دار نہ زمین دار ہیں۔ ہم تو اب صرف آپ کے غلام بن کر رہ گئے ہیں''۔ علی اکبر نے کہا۔

''بیگم! میں نے بہت غور و فکر کے بعد اپنی کوٹھی 'نشیمن' آپ کے مہر میں لکھ دی ہے''۔

''اس کی کیا ضرورت تھی''؟ آپ کی محبت کے سہارے میں زندگی گزار لوں گی''۔ شکیلہ بیگم نے کہا۔ جو خود ایک اُجڑے رئیس کی اولاد تھیں۔ لہٰذا ان کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ زمانہ تبدیل ہو گیا ہے۔ ہواؤں کا رُخ بدل گیا ہے۔ جو کبھی بڑے تھے وہ سڑکوں پر بے کار ٹہل رہے تھے اور جو سڑکوں پر ٹہلا کرتے تھے وہ حکومت کی اونچی اونچی کرسیوں پر براجمان تھے۔

اللہ کا نظام ہی کچھ اس طرح کا ہے کہ جن قوموں نے اس کے احکامات کو فراموش کر دیا، ناانصافی کا بول بالا ہونے لگا، حقدار کا حق چھین لیا گیا، حرام کو حلال قرار دیا جانے لگا، رشوت کا بازار گرم ہوا اور سود خوری روز مرہ کی عادت میں شامل ہو گئی۔ چنانچہ قدرت کو جلال آیا اور غریب رعایا پر ظلم ڈھانے والے زمینداروں کو اس نے عرش سے فرش پر پٹخ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زمینداری بانڈ حاصل کرنے کے لئے ان افسروں کے دَر پر حاضری دینے پر مجبور ہو گئے، جن کو وہ رزیل اور نیچ تصور کرتے تھے۔

''سنئے''! شکیلہ بیگم نے علی اکبر سے دبی زبان میں کہا۔

''ہاں...... فرمایئے''۔

''گھر میں غلے کے نام پر کچھ بھی نہیں ہے۔ کہیں سے انتظام کیجئے''۔

''میں کیا کر سکتا ہوں؟ رام جتن بنیا کے یہاں سے اُدھار منگوا لیجئے''۔

''پہلے کا بقایا ابھی تک اُدا نہیں ہوا ہے''۔

'بھئی آپ ہی کچھ کیجئے...... حقہ تازہ کر کے بیٹھک میں بھجوا دیئے۔ حاجی صاحب اور میر صاحب آتے ہی ہوں گے''۔

بقول غالب۔ ''اللہ تعالیٰ نے رزق کا تو وعدہ کیا ہے۔ کہیں نہ کہیں سے انتظام کرے گا مگر حقہ اور تمباکو کا کوئی وعدہ نہیں ہے''۔

نشیمن کی شان وشوکت ختم ہو چکی تھی۔ خورد ونوش کا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ علی اکبر کی پہلی بیوی کے صاحبزادے علی امیر نے نہ تعلیم حاصل کی اور نہ کوئی ہنر سیکھا کہ دو پیسے کما کر لے آتے۔ اس زمانے میں محض دس کلاسیں پاس کر کے باعزت سرکاری نوکری حاصل کی جاسکتی تھی مگر دماغ میں ایک فتور یہ کہ شرفاء کے بچے اسکول نہیں جاتے۔ تعلیم کی کمی نے پوری قوم کو کہیں کا نہ رکھا۔ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ تعلیم حاصل کرنے کیلئے چین بھی جانا پڑے تو جاؤ۔ مگر افسوس چین جانا تو دُور کی بات ہے مسلمانوں نے علی گڑھ تک جانا گوارہ نہیں کیا کہ پڑھ لکھ کر کسی قابل بن سکیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے فن کے اُن میدانوں میں زبردست مہارت حاصل کی جن کی شرعی طور پر ممانعت تھی۔

ایک زمانہ گزر گیا علی اکبر اور شکیلہ بیگم کا بیٹا علی امام اسکول جانے لگا۔ مگر غربت اور بیماری نے سب کو توڑ کر رکھ دیا۔ ایک رات علی اکبر سخت بیمار پڑے اور دیکھتے دیکھتے آنکھیں بند ہو گئیں۔ تجہیز وتکفین کا سارا انتظام نواب صاحب کے دیرینہ دوست راجہ بازار کے ساہوکار رستوگی کے تعاون سے ہوا۔ سیکڑوں کی تعداد میں لوگوں نے ان کے چالیسویں میں شرکت کی۔ لکھنؤ کے روایتی بھانڈ بھی مدعو تھے۔

دستر خوان پر ایک بھانڈ نے دوسرے سے اپنے گوشت کے پیالے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''اس سے وضو جائز ہے''۔

''بالکل نہیں...... اس سے وضو قطعی جائز نہیں ہے''۔ دوسرے نے جواب دیا۔ اور پھر دونوں میں بحث شروع ہوگئی۔ تیز تیز آواز سن کر علی امیر نے ان سے بحث کی وجہ دریافت کی۔ ایک نے کہا ''حضور! میں یہ کہہ رہا ہوں کہ شوربہ سے وضو جائز ہے۔ مگر یہ ماننے کے لئے تیار نہیں''۔

علی امیر نے دیکھا کہ پیالے میں صرف شوربہ ہے، بوٹیوں کا نام تک نہیں۔ موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے انہوں نے فوراً دوسرا پیالہ بوٹیوں سے لبریز ان کے سامنے پیش کردیا اور بحث ختم ہوگئی۔

شکیلہ بیگم ساہوکار رستوگی کے قرض سے گردن تک ڈوب گئیں۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور رستوگی کا قرض کی ادائیگی کا دباؤ بڑھنے لگا۔ لہٰذا شکیلہ بیگم نے نشیمن کے نصف حصہ کو فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا اور اپنے سوتیلے بیٹے علی امیر کو نشیمن چھوڑنے کا حکم صادر فرمادیا۔

علی امیر اس فیصلے کو سنتے ہی پریشان ہوگئے۔ ان کے پیروں سے جیسے زمین کھسک گئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے چھ عدد بچوں کو لے کر کہاں جائیں۔ انہوں نے بہت عاجزی سے کہا۔

''لیکن میں کہاں جاؤں''؟

''کہیں بھی جایئے...... آپ کے علم میں شاید ہو کہ یہ کوٹھی نواب صاحب نے میرے مہر کے عوض میرے نام لکھ دی تھی۔ لہٰذا اس کا آدھا حصہ بیچنا میری مجبوری ہے''۔

علی امیر بھاری دل سے آنکھوں میں آنسو لئے اپنی بیوی بچوں کو لے کر اپنی سسرال چلے گئے اور نشیمن کا آدھا حصہ فروخت ہوگیا۔ اس حصہ میں رستوگی نرسنگ ہوم کھل گیا۔ سوئی ہوئی

کوٹھی میں جیسے بہار آ گئی۔ نرسنگ ہوم میں چوبیس گھنٹے چہل پہل رہنے لگی۔ مریضوں اوران کے تیمارداروں کی آمدورفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ کے مصداق نرسنگ ہوم کے ارد گرد چھوٹی چھوٹی ضروریات کی دوکانیں کھل گئیں۔ سب سے بڑی دُکان شکیلہ بیگم کے بیٹے علی امام نے کھولی۔ علی امام بیحد محنتی اور بااخلاق شخصیت کے مالک تھے۔ بڑوں کی عزت کرنا اپنا فرض اوّلین سمجھتے تھے۔ اپنی خوش اخلاقی اور خوش مزاجی سے انہوں نے سب کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی تھی۔ ان کی دوکان دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگی۔ اور بہت کم عرصہ میں دوکان نے ایک بڑے پرووِیزن اسٹور کی شکل اختیار کر لی جس میں درجنوں ملازم کام کرنے لگے۔ آمدنی بڑھی تو نشیمن کے حالات بدلنے لگے۔ خوشحالی جس نے اپنی نظریں پھیر لی تھیں نشیمن میں پھر قدم جمانے لگی۔ سب کے چہروں پر رونق آ گئی۔ مگر بدلے ہوئے حالات میں بھی نواب علی اکبر کے بیٹے علی امیر کو کوٹھی میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اپنی جائے پیدائش سے فطری اور جذباتی تعلق کی بنا پر وہ اکثر نشیمن میں آتے تھے اور باہری کمرے میں تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جاتے تھے۔ جائیداد سے بے دخل ہونے کا ان کو دلی صدمہ تھا۔ مگر وہ صبر کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

شکیلہ بیگم کے بیٹے علی امام کی شادی ہوئی اور دوسرے سال ہی بیٹی مریم تولد ہوئیں۔ علی امام نے اپنی بیٹی کی بڑے نازوں سے پرورش کی۔ شہر کے سب سے اچھے پبلک اسکول میں تعلیم دلوائی۔ مریم خوبصورت تھی اور ذہین بھی۔ دیکھتے دیکھتے اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ دیا۔ بہت جلد وہ میڈیکل کی تعلیم حاصل کر کے ڈاکٹر بن گئی۔ اپنی ہی کوٹھی نشیمن میں واقع رستوگی نرسنگ ہوم میں بحثیت لیڈی ڈاکٹر اپنے فرائض انجام دینے لگی۔ علی امام کے لئے یہ فخر کی بات تھی کہ ان کی بیٹی شہر کی مشہور لیڈی ڈاکٹر بن گئی۔ ہر شخص ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ شہر کے متمول اوراعلیٰ خاندان سے ڈاکٹر مریم کے رشتے آنے لگے۔ علی امام کی نظر میں سب سے بہتر رشتہ ریٹائرڈ چیف میڈیکل افسر ڈاکٹر مخدوم عالم مرحوم کے لائق بیٹے ڈاکٹر محبوب عالم کا تھا۔ جو

شہر کی سب سے بڑی کوٹھی آشیانہ میں اپنی سوتیلی والدہ شاہین بیگم کے ساتھ رہتے تھے۔ڈاکٹر مریم کی شادی ڈاکٹر محبوب عالم سے طے ہوگئی۔

شادی کی تقریب بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔شہر کے اعلیٰ افسروں کے علاوہ حکومت کے کئی وزیروں نے شادی میں شرکت کی۔بارات کے ساتھ ڈاکٹر مریم رخصت ہوکر اپنی سسرال آشیانہ چلی گئیں۔علی امام ڈاکٹر محبوب عالم جیسا داماد اور آشیانہ جیسا سمدھیانہ پاکر پھولے نہ سمارہے تھے۔

چوتھی کی رسم کے مطابق علی امام اپنی بیٹی ڈاکٹر مریم کو رخصت کرانے آشیانہ پہنچے اور شاہین بیگم سے رخصتی کی بات ہوئی، مگر شاہین بیگم نے اپنا جو فیصلہ سنایا، ان کو بے ہوش کرنے کے لئے کافی تھا۔

شاہین بیگم نے کہا ''سمدھی صاحب! بیٹی کے ساتھ اپنے داماد کو بھی لے جائیں۔کیونکہ میں نے اس کوٹھی کو فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے''۔

''مگر ڈاکٹر محبوب عالم...... وہ کہاں رہیں گے''؟ علی امام نے خشک گلے میں تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

''جہاں چاہیں رہیں، ان کی مرضی۔'آشیانہ' پر ان کا کوئی حق نہیں ہے۔ان کے مرحوم والد ڈاکٹر مخدوم عالم نے یہ کوٹھی میرے نام مہر میں لکھ دی تھی''۔شاہین بیگم نے کہا۔

''کیا کہا......؟ مہر میں لکھ دی تھی''۔

''جی ہاں!''

اتنا سن کر علی امام چکر کھا کر گرتے گرتے بچے اور سوچنے لگے کہ بالکل اسی طرح میرے سوتیلے بڑے بھائی علی امیر کو میری والدہ نے نشیمن سے نکال باہر کیا تھا۔

......☆......

(روزنامہ ''آگ'' لکھنؤ اور ''گوشوارہ'' رڑکی۔جولائی ۲۰۰۸ء)

لیڈی اسٹینو گرافر

دلّی میں ٹریننگ ختم کر کے میں لکھنوٴ آ گیا، جہاں میری پوسٹنگ ہوئی تھی۔ یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا جب مجھے افسر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ نیا نیا افسری کا نشہ تھا، اور دماغ میں یہ فطور کہ افسر اور پروفیسر نے اگر جوائن کرتے ہی اپنی دھاک نہ جمالی تو پھر زندگی بیکار۔ لہٰذا میں نے ایک پرانی شیورلیٹ کار خرید لی۔ ویسے تو وہ اولڈ تھی مگر بالکل نئی کی مانند دکھائی دیتی تھی۔ کیونکہ یہ گاڑی میں نے ایک امریکن سے خریدی تھی جسے ہر چیز قاعدہ کے مطابق رکھنے کی بیماری تھی۔

دھڑکتے دل سے میں اپنے نئے آفس میں داخل ہوا۔ میری چمکتی ہوئی شیورلیٹ کار جیسے ہی پورٹیکو میں رُکی، ایک چپراسی نے دروازہ کھول کر سلام کیا۔ میں ایک عجیب انداز بے نیازی سے کار سے باہر نکلا اور میں نے دیکھا کہ دفتر کے ہر شخص کی نگاہیں میری چمچماتی کار پر لگی تھیں، جسے بڑی حسرت سے دیکھ رہے تھے۔

ایک ادھیڑ عمر شخص نے آگے بڑھ کر دریافت کیا:

''جناب۔ آپ کی تعریف''؟

''مجھے عقیل صدیقی کہتے ہیں۔ میری پوسٹنگ یہیں ہوئی ہے''۔

''ارے صدیقی صاحب...... ہم سب تو آپ کی آمد کے منتظر تھے''۔

''ویسے...... آپ کی تعریف''۔

''مجھے محمود عثمانی کہتے ہیں اور میں بھی آپ کے ساتھ کام کروں گا''۔ انہوں نے جواب دیا۔

''اوہ...... بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر''۔ میں نے بڑی شانِ بے نیازی سے کہا۔

مجھے ایسا لگا گویا ان کا مجھ سے ملنا ایک فخر کی بات تھی۔

''آپ کی کار بہت خوبصورت اور قیمتی ہے'' عثمانی صاحب نے کہا۔

''جی...... شکریہ''...... میرا خیال ہے کہ مجھ کو عظیم صاحب کو جوائننگ رپورٹ دے دینا چاہئے۔ کیوں؟

''جی ہاں...... درست فرمایا...... عظیم صاحب کا وہ کمرہ ہے'' کہہ کر عثمانی صاحب دوسری طرف چلے گئے۔

عظیم صاحب کے کمرے کے سامنے پہنچتے ہی چپراسی نے پردہ اُٹھا دیا۔ میں کمرہ میں داخل ہو گیا۔ میرے سامنے ایک لحیم شحیم شخصیت بہت قیمتی کرسی پر بیٹھی تھی۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا...... ''میں عقیل صدیقی ہوں'' یہ کہہ کر میں نے اپنا تقرری کا خط ان کی میز پر رکھ دیا۔

''اوہ...... اچھا...... صدیقی صاحب اس کی ایڈوانس کاپی مجھ کو مل چکی ہے''۔ انہوں نے گھنٹی بجا کر چپراسی سے عثمانی صاحب کو بلانے کا حکم فرمایا۔

''آپ تعلیم یافتہ نوجوان ہیں، مجھے قوی اُمید ہے کہ آپ اپنی ذمہ داریوں کو بڑی خوبی سے انجام دیں گے''۔ اتنے میں عثمانی صاحب آ گئے۔

''مسٹر عثمانی...... یہ آپ کے اسسٹنٹ مسٹر عقیل صدیقی ہیں'' عظیم صاحب نے ان کا مختصر تعارف کرایا۔

''میں ان سے آتے ہی مل چکا ہوں''۔ عثمانی صاحب نے کہا اور مجھے لے کر میرا کمرہ دکھانے اور کام کو سمجھانے چلے گئے۔ دفتری طور وطریقہ سے واقفیت کے سلسلہ میں تھوڑی تفصیلی گفتگو لیکچر کے انداز میں کیا۔ میں نے بڑی سنجیدگی سے ان کی باتوں کو سنا اور ذہن نشین کر لیا۔

کام کرتے ہوئے مجھے کئی ماہ گزر گئے۔ دفتر کے بابوؤں کے علاوہ سارے افسران میری عزت کرتے تھے۔ ایک بار عثمانی صاحب کو عظیم صاحب سے میری تعریف کرتے ہوئے خود

میں نے سنا۔ کوئی بھی اسٹاف بغیر اجازت میرے کمرے میں داخل نہیں ہوتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے دیکھتے ہی اسٹاف خاموش ہو جاتا ہے۔ سگریٹ نوش حضرات یا تو سگریٹ پھینک دیتے تھے یا پیچھے چھپا لیتے تھے۔ جس طرف میری کار نکل جاتی سلام کے لئے سیکڑوں ہاتھ اُٹھ جاتے۔ کلب میں بھی میری لیاقت اور رُعب اور دبدبہ کا ذکر ہوتا تھا۔ میں محسوس کرر ہا تھا کہ میری لیاقت کا جادو افسروں اور ماتحتوں میں یکساں اثر انداز ہو رہا ہے۔

مجھے ابھی اسٹینوگرافر نہیں ملا تھا۔ میرا اور عثمانی صاحب کا کام ایک ہی اسٹینوگرافر سے چل رہا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے اس کمی کا احساس ہونے لگا۔ لہٰذا میں نے کئی بار عثمانی صاحب اور عظیم صاحب کے گوش گزار کیا۔ آخر کار عظیم صاحب نے اسٹینوگرافر کی خالی جگہوں کے لئے آئی درخواستوں کے مطابق امیدوار کو بلانے کا حکم صادر فرما دیا۔ کامیاب امیدواروں میں صرف ایک لڑکی رضوانہ کا نام آیا۔ عثمانی نے مجھ سے کہا۔

''صدیقی صاحب...... اگر آپ پسند کریں تو اپنا اسٹینو آپ کو دے دوں۔ نئی اسٹینو سے شاید کام لینا تھوڑا مشکل ہوتا ہے''۔

''بہت بہت شکریہ...... آپ تکلیف نہ کریں۔ نئے کام کرتے کرتے کہنہ مشق ہو جاتے ہیں اور پھر میں زیادہ ڈکٹیشن کا عادی نہیں ہوں''۔ مجھے عثمانی کی ہوشیاری پر غصہ آ رہا تھا۔ دادا نانا بن گیا ہے بڈھا اور لڑکی اسٹینوگرافر کی خواہش ہے۔

میں اپنے کمرہ میں سر جھکائے کوئی نوٹ لکھ رہا تھا کہ اچانک خوشبو کا ایک جھونکا آیا اور جب میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو شلوار سوٹ میں ایک خوبصورت لڑکی میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے انٹرویو لیٹر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک خوبصورت اور مہذب لڑکی جو اچھے ڈریس میں مریم کی پاکیزگی کی تصویر بنی خاموش بیٹھی ہے۔ میں نے اس کا انٹرویو لیتے ہوئے پہلا سوال کیا۔

''آپ کی تعلیم''؟

''بی کام''

''اسپیڈ کیا ہے''؟

''جی...... شارٹ ہینڈ سو اور ٹائپ پچاس''۔

''تمہارے خاندان کے دیگر افراد کون کون ہیں''؟

''میں......'' وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولی...... ''میں، والدہ اور چھوٹا بھائی''۔

''اور والد صاحب''؟

''تین سال قبل ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ ریلوے کے ریٹائرڈ گارڈ تھے۔ تب سے ہم لوگ اپنے ماموں کے گھر مولوی گنج میں رہتے ہیں۔ اب میری نوکری لگ گئی تو شاہ نجف روڈ پر کوئی کرائے کا مکان لے لیں گے تاکہ آفس اٹینڈ کرنے میں آسانی ہو سکے''۔ اس نے تفصیل سے بیان کیا۔

نہ معلوم کیوں مجھے رضوانہ سے ہمدردی سی ہو گئی۔ وہ جب ڈکٹیشن لینے بیٹھی تو میں نے سر پکڑ لیا۔ میرے بہت آہستہ آہستہ ڈکٹیشن دینے کے باوجود وہ لکھ نہیں سکی۔ رفتار بتائی ہوئی رفتار سے بہت کم تھی۔ پریشانی میں اس کی خوبصورت پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اُبھر آئیں۔ میں نے کہا...... ''رضوانہ! اس طرح کیسے کام چلے گا''۔

وہ کچھ نہیں بولی بلکہ اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کی آبدیدہ آنکھوں کو دیکھ کر نہ جانے کیوں میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں نے اسے سمجھایا۔

''پریشان نہ ہو...... دو چار دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا''۔

ایک دن لنچ سے لوٹنے پر میں نے رضوانہ کے پاس ایک نوجوان کو بیٹھا اور گفتگو کرتے پایا۔ میرے آتے ہی وہ نوجوان فوراً کمرہ سے باہر نکل گیا۔ دوسرے دن پھر میں نے حضرت گنج میں اس نوجوان کو رضوانہ کے ساتھ گھومتے دیکھا۔ میں نے ان کے قریب اپنی کار روکی اور سختی سے پوچھا:

''کہاں گھوم رہی ہو رضوانہ''؟

''سر...... گھر جارہی ہوں'' اس نے جواب دیا۔

''چلو بیٹھ جاؤ...... میں تم کو تمہارے گھر چھوڑ دوں گا''۔

''نہیں سر...... بہت بہت شکریہ۔ میں قریب ہی رہتی ہوں چلی جاؤں گی''۔

اس کی بات مجھے اچھی نہیں لگی۔ میں نے اپنی بغل والی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے حاکمانہ انداز میں کہا۔ ''چلو بیٹھو ادھر'' اس نے اس نوجوان کی طرف ایک نظر ڈالی اور کار میں آ کر بیٹھ گئی۔

''دفتر سے سیدھے گھر آیا کرو۔ تمہارا اس طرح گھومنا بہتر نہیں ہے۔ میں نے کار چلاتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے آگے ونڈ اسکرین سے سڑک کی طرف دیکھتی رہی اور بمشکل ایک کلومیٹر چلی ہوگی کہ اس نے کہا۔

''سر...... کار روک دیجئے۔ میرا گھر آ گیا۔ میں اسی گلی میں رہتی ہوں''۔ کہہ کر وہ اُتری اور گلی میں داخل ہوگئی۔

''اچھی بھلی لڑکیاں'' میں نے سوچا ''بُری صحبت میں پڑ کر برباد ہو جاتی ہیں''۔

تقریباً ہر دس پندرہ دن پر رضوانہ کے نام ڈاکیہ گلابی رنگ کا ایک لفافہ دے جاتا تھا۔ رضوانہ جیسی سیدھی اور شریف لڑکی کے سلسلہ میں کسی قسم کا شک کرنا گناہ تھا مگر پھر بھی نہ جانے کیسے غیر متوقع طور پر اس کی غیر موجودگی میں آیا گلابی لفافہ میں نے کھول ڈالا۔ خط کی ابتدا پیاری رضوانہ اور اختتام تمہاری والدہ پر تھا۔ پورے خط میں اس کی ماں نے اپنی مالی مشکلات، گھر کی خستہ حالت اور چھوٹے بھائی کی بروقت فیس جمع نہ ہونے پر نام کا کٹ جانا وغیرہ کا ذکر تھا۔ خط کو پڑھنے کے بعد مجھے انتہائی شرمندگی محسوس ہوئی۔ اس بات پر میں سخت نادم تھا کہ رضوانہ ایسی شریف لڑکی کے بارے میں اس قسم کی گندی باتیں ذہن میں آئی ہی کیوں؟ میں نے طے کیا کہ میں رضوانہ کو لے کر حضرت گنج جاؤں گا اور عید الفطر کے موقع پر تحفہ کے بہانے اسے اور اس کے

خاندان کے لئے نئے نئے کپڑے اور دوسرے ضروری سامان خریدوں گا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ہوسکتا ہے کہ میرا تحفہ وہ قبول نہ کرے۔ایسی حالت میں، میں اس کو ڈانٹ دوں گا اور کہوں گا۔

''رضوانہ...... تم کو یہ سب چیزیں لینی پڑیں گی۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں تمہارا اتنا خیال کیوں کرتا ہوں۔ تمہیں کسی غیر مرد کے ساتھ دیکھنا مجھے کیوں پسند نہیں۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مجھے اپنی بہن سلمہ یاد آ جاتی ہے جو تمہاری ہم شکل تھی۔اگر آج وہ اس دنیا میں زندہ ہوتی تو تمہاری ہم عمر ہی نہیں بلکہ تمہاری ہم شکل بھی ہوتی۔آج جب کہ وہ زندہ نہیں ہے تو میں تمہیں پا کر ایسا محسوس کر رہا ہوں گویا کہ دس سال بعد میری بہن سلمہ لوٹ آئی ہے۔ میں جذبات کے رو میں پتہ نہیں کیا کیا سوچتا رہا کہ اتنے میں کمرہ کا دروازہ کھلا اور رضوانہ داخل ہوئی۔

''تمہارا خط ہے رضوانہ......''میں نے اس کا خط اس کی طرف بڑھا دیا۔

کھلا خط دیکھ کر وہ خط ہاتھ میں لئے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی اور اپنی میز پر جا کر بیٹھ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ میری اس حرکت پر وہ انتہائی غصہ میں ہے۔ معافی مانگنے کا خیال آیا مگر پھر خیال آیا کہ چھوٹی بہن ہے کسی اور موقع پر معذرت کرلوں گا۔

لنچ سے واپس لوٹا تو دیکھا کہ عظیم صاحب کے کمرے کے سامنے دفتر کے سارے ملازمین ایک بھیڑ کی شکل میں کھڑے ہیں۔ میں اپنے کمرہ میں پہنچا، وہاں رضوانہ نہیں تھی۔ایک چپراسی نے آ کر کہا۔

''بڑے صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں''۔ میں جلدی سے عظیم صاحب کے کمرے کی طرف لپکا۔انہوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کہا۔

''آپ کے خلاف سارے اسٹاف کی موجودگی میں رضوانہ نے مجھ سے یہ شکایت کی ہے کہ آپ اس کو بُری نظر سے دیکھتے ہیں۔کیا سچ ہے''؟

''یہ غلط ہے...... بلکہ یہ بے بنیاد بات ہے عظیم صاحب''...... میں نے غصہ میں کہا۔

''کیا یہ بھی غلط ہے کہ وہ اپنے ماموں زاد بھائی کے ساتھ جا رہی تھی اور آپ نے

رضوانہ کو زبردستی اپنی کار میں بٹھا کر اس کے گھر پہنچایا''۔

''مگر میرا خیال تھا سر کہ وہ......'' میں آگے کچھ کہہ نہ سکا، گلا خشک ہو گیا۔

''تو یہ بھی غلط ہے کہ آپ نے اپنی اسٹینو کے خط کو کھول کر پڑھا، جس کی وجہ سے سارے ملازمین آپ کی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت کی وجہ سے آپ کے خلاف ہو گئے ہیں اور نہیں چاہتے کہ آپ یہاں کام کریں۔ لہٰذا میں نے یہی بہتر سمجھا کہ آپ کچھ دنوں کی چھٹی پر چلے جائیں...... میں یہاں سے بنگلور تبادلہ کی سفارش کر دوں گا......''

میں ایک ہارے جواری کی طرح سر جھکائے ہلکے ہلکے قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ ملازمین سے آنکھیں ملانے کی بھی تاب نہ تھی۔ چند دنوں بعد بنگلور پہنچ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وہاں کی لیڈی اسٹینو کو ہٹا کر بوڑھے اسٹینو رکھ لیا۔ اور کان پکڑ لیا کہ اب پھر کبھی لیڈی اسٹینوگرافر نہیں رکھوں گا۔

......☆......

(ہفت روزہ ''دُنیا'' لکھنؤ۔ ۲ر مارچ ۱۹۶۱ء)

طنز و مزاح

حاجی صاحب کی ڈائری

طنز و مزاح کا یہ سلسلہ وار مضمون جناب حسین امین کے زیر ادارت شائع ہونے والے ہفت روزہ ''دنیا'' لکھنؤ میں ۱۹۵۸ء اور ۱۹۵۹ء کے شماروں کا زینت بنا۔ اس زمانہ کے چھوٹے چھوٹے مسائل پر حاجی صاحب کی تیز نظر پڑتی تو وہ ان کا بخوشی کوئی نہ کوئی حل نکال لیتے۔ قارئین نے اس مزاحیہ سلسلہ کو کافی پسند کیا اور ہر ہفتہ کسی نئے مسئلہ پر حاجی صاحب کی بیش قیمت رائے جاننے کے منتظر رہا کرتے تھے۔ حاجی صاحب کو دُنیا کے ہر موضوع پر بولنے پر وطیرہ حاصل ہے۔ خواہ وہ سیاست، مذہبیات، سائنس اور ٹیکنالوجی سے متعلق ہو، اپنی گرانقدر رائے پیش کرنا اپنا اوّلین فرض تصور کرتے ہیں۔ اس ڈائری کی قسطیں میں گورکھپور سے ہر ہفتہ لکھنؤ بھیجتا تھا۔

حاجی صاحب ایک ایسا کردار ہے جو آپ کو ہر شہر اور ہر محلّہ میں بہ آسانی مل جائے گا۔ ایسے لوگ خود اپنے غم کو بھول کر دوسروں کے غم میں گھلے جاتے ہیں۔ دُنیا میں اگر ایسے لوگ نہ ہوتے تو ان اشخاص کا کیا ہوتا جن کا اللہ کے سوا کوئی سہارا نہیں ہے۔ مجبور، مظلوم اور پریشان حال عوام کے واحد مسیحا ہیں ہمارے حاجی صاحب۔ زمانہ کے ہر دور کے سماج میں کچھ بے لوث خدمت کرنے والے گزرے ہیں۔ دوسروں کے درد کو اپنا ذاتی درد تصور کر کے جی جان سے خدمت میں لگے رہنا ان کی فطرت میں شامل ہوتا ہے۔ احسان کر کے اس کے ذکر سے بھی پرہیز کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ احسان جتانے والے جنت میں نہیں جائیں گے۔ لیکن وہ اس بات سے بھی متفق ہیں کہ احسان فراموش جیسی لعنت سے گریز کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ ان کا اصول بہت واضح ہے کہ نیکی کر دریا میں ڈال۔ کسی نے کہا حاجی صاحب! آج کے دور میں نیکی

کرنے والے ہی کو دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ تب فرماتے ہیں کہ یہ قطعی نہ بھولو کہ تم کو اپنے سارے اچھے بُرے اعمال کا حساب دینا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اپنا محاسبہ کرتے رہا کرو۔ والدین کی نافرمانی سے بچو۔ کیونکہ والدین کے منھ سے نکلی بددُعا دین و دُنیا، دونوں کو تباہ کر دیتی ہے۔

ساس بہو کی تُو تُو مَیں مَیں

کئی روز سے سوچ رہا تھا کہ کسی دن مولوی خیرات حسین صاحب کی لڑکی شکیلہ سے مل آؤں۔ اس نے کئی مرتبہ بلوا بھیجا اور شکایت بھی کی کہ جب سے اس کی شادی ہوئی ہے حاجی چچا پوچھنے بھی نہیں آئے کہ آیا زندہ ہے یا مر گئی۔

واقعی مجھے خود شرمندگی تھی۔ شادی کو ایک سال ہونے کو آئے تھے مگر میں اس سے مل نہ سکا تھا۔ دوسرے ہی دن اس کی سسرال پہنچ گیا، جنہوں نے میری بڑی خاطر و مدارات کی، ان کا حسن اخلاق دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ مجھے وہ زمانہ یاد آ گیا جب میری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ سسرال جاتا تھا تو جمن کی ماں اپنے ہاتھوں سے زبردستی حلوہ منھ میں ٹھونس دیتی تھیں۔ خدا اُن کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، کیا زمانہ تھا وہ بھی۔ اب تو جیسے خواب کی باتیں ہو گئیں۔

کمرہ میں صرف شکیلہ رہ گئی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس کی خیریت دریافت کروں۔ اس لئے میں نے کہا...... ''شکیلہ بیٹی! اچھی تو ہو...... سسرال میں کوئی تکلیف تو نہیں......'' اتنا کہنا تھا کہ شکیلہ کی آنکھیں آنسوؤں کی جھڑیاں گرانے لگیں اور وہ پھر مجھ سے لپٹ کر بہت دیر تک روتی رہی۔ میں نے اس کو چپ کرایا، چمکار کر پوچھا...... ''بیٹی...... کیا تکلیف ہے تمہیں یہاں؟...... کہنے لگی...... ''حاجی چچا...... مجھے کوئی تکلیف نہیں...... یہ بھی بہت خیال رکھتے ہیں...... مگر ان کی ماں سے میری نہیں نبھتی۔ روز جنگ کا سامان تیار ہو جاتا ہے''...... ''بڑھیا اپنے آگے کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں''...... میں نے شکیلہ سے پوچھا...... ''اور یہ کیا کرتے ہیں'' اس جملہ پر تو شکیلہ جیسے تڑپ کر رہ گئی۔ کہنے لگی...... یہ کیا کریں گے۔ یہ تو پورے مولوی ہیں...... ''کسی

نے سمجھا دیا ہے کہ ماں کے پیروں کے نیچے جنت ہے۔ بس یہ اپنی جنت کے چکر میں میری زندگی جہنم بنا رہے ہیں''۔

میں نے سوچا خدا بچائے اس ساس بہو کے جھگڑوں سے۔ بہو کے آتے آتے جنگ کا سارا سامان تیار ہو جاتا ہے اور بیچارے لڑکے کی زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ ایک طرف شریک حیات اور دوسری طرف اس کی جنت کی مالک۔ وہ بیچارہ کرے تو کیا کرے؟

میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ جمن نے آتے ہی گھر میں اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا تھا بلکہ یوں کہیے کہ اپنا سکّہ چلانا شروع کر دیا تھا۔ جنگ کا آغاز ہوا۔ لعن طعن کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ محلّہ والوں کو تفریح کا ذریعہ اور مفت کا تماشا دیکھنے کو مل گیا تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا تو ایک روز غصہ میں لال ہو کر کہا...... اجی اے...... میں اس روز روز کی جھک جھک سے عاجز ہو گیا ہوں۔ مجھے بالکل پسند نہیں ہے کہ روز میان سے تلواریں نکل رہی ہیں اور گولے داغے جا رہے ہیں۔ میں ان سب خرافات کو بالکل پسند نہیں کرتا...... کان کھول کر سن لو...... میں بیوی چھوڑ سکتا ہوں...... ماں کو نہیں...... بیویوں کا جہاں تک تعلق ہے، اسی مولوی گنج میں بہت سی بیوی مل جائیں گی...... مگر ماں پوری دُنیا میں نہیں مل سکتی۔ اگر تمہیں اس گھر میں رہنا ہو تو قاعدے سے رہو ورنہ ۳۵/روپے دس آنے مہر کے لو اور چھ آنے رکشے کے اور چلی جاؤ اپنے......''

بس صاحب...... وہ دن اور آج کا دن...... سکون کی زندگی چل رہی ہے۔ اس پھٹکار کا اثر جادو سا ہوا۔ جمن ساری ہیکڑی بھول گئیں اور ایسی بھیگی بلّی بنیں کہ آج تک سوکھ نہ سکیں۔ نہ جنت سے ہاتھ دھونا پڑا اور نہ بیوی سے۔

(ہفت روزہ ''دُنیا'' لکھنؤ۔ ۲/اگست ۱۹۵۸ء)

......☆......

عشق کے چکر میں

فجر کی نماز پڑھ کر نکلتے ہی یہ خبر ملی کہ رات جمن کی لڑکی رشید کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدا کی

ماران نوجوانوں پر۔ آنکھیں کھولیں اور عشق ومحبت کے سارے فوائد جان گئے ۔ایک ہم لوگوں کا زمانہ تھا۔آدھے آدھے درجن لڑکے پیدا ہو جاتے مگر دلہن اس طرح شرماتیں جیسے آج ہی شادی ہوئی ہے۔آج کل کی لڑکیاں خدا کی پناہ۔ معلوم ہوتا ہے جیسے سارے جسم میں بجلی کا تار لگا ہوا ہے۔اس طرح اُچھلتی کودتی ہیں کہ دوپٹہ کا بھی لحاظ نہیں رہتا۔آج کل کے باپ بھی ویسے ہی ہو گئے ہیں، بیٹی کو بی.اے۔ایم.اے.تک پڑھاتے ہیں اور پڑھتے پڑھتے وہ بوڑھی ہونے لگتی ہیں۔اس پر طرہ یہ کہ اگر کہیں سے شادی کا رشتہ آیا تو فرماتے ہیں ابھی ''بے بی'' کی عمر ہی کیا ہے۔ایم.اے.کر رہی ہے۔لعنت ہے ایسی بے بیوں پر۔

باپ بے بی کہتے ہیں اور بے بی کسی چھوکرے کے ساتھ فلم میں کام کرنے بمبئی بھاگ جاتی ہیں۔خیر مجھ سے کیا۔ مجھے کیا لینا دینا ہے ان باتوں سے۔ہاں اکثر وہ زمانہ یاد آتا ہے جب میں سکینہ سے سچی اور دِلی محبت کرتا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ محبت کس چڑیا کا نام ہے۔وہ جب سکینہ روز نئی نئی چیزیں پکا کر بھیجنے لگی تب کہیں سمجھ میں آیا۔مگر خدا جھوٹ نہ بلوائے، کبھی اس سے بات بھی نہیں کی۔وہ تو کلو قصائی کے لونڈے نے سکھا پڑھا کر بھیجا کہ سکینہ سے یوں کہنا کہ سکینہ ...... ''میں تم سے محبت کرتا ہوں...... تم میرے دل کی رانی ہو''۔اور خدا جانے کیا کیا کہا تھا کمبخت نے...... کئی روز کے سخت ریاض کے بعد بڑی ہمت کر کے میں نے جیسے ہی کہا کہ سکینہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔اتنے میں اس کا باپ آتا ہوا نظر آیا اور اس کو دیکھتے ہی سارے ڈائیلاگ بھول گیا اور پیشاب خطا کر گیا۔ خدا بچائے اس محبت کے چکر سے۔

(ہفت روزہ ''دُنیا'' لکھنؤ۔۱۵رنومبر ۱۹۵۸ء)

......☆......
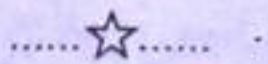
نئے زمانے کے گانے

بیرسٹر صاحب کی بات بھلا کیسے ٹالتا، جبکہ اپنا کام ہی خدمت خلق ہے۔انہوں نے کہا حاجی صاحب! اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو چھوٹے صاحبزادے انور میاں کو حضرت گنج سے کچھ

شاپنگ کرادیجئے۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہوتا۔ میں میاں انور کو لے کرامین آباد اور نظیرآباد ہوتے ہوئے گنج کی طرف جارہا تھا کہ راستے میں نہ جانے کس دُکان سے ریکارڈنگ ہورہی تھی۔ بڑا بے ہودہ گانا بج رہا تھا۔ جی چاہا کہ کان میں اُنگلیاں ڈال لوں۔ مگر پھر سوچا ذرا سن تو لوں یہ آج کل کے سنیما میں کیسے گانے گائے جاتے ہیں۔

خدا کی مار ایسے گانوں پر۔ کیا گانے بنائے۔ جادوگر سیاں...... چھوڑ موری بہیاں...... توبہ توبہ۔ لاحول ولاقوۃ۔ کیا زمانہ آ گیا ہے۔ کھلے میدان میں ایسے فحش گانے بجتے ہیں۔ اب آپ ہی بتایئے کہ ان گانوں کو سن کر بچوں کے دماغ پر کیا اثر پڑے گا۔ اگر لڑکے بھاگ کر بمبئی چلے جاتے ہیں تو کیا بُرا ہے۔ جب بچپن سے ہی سب سنیں گے تو ایسی ہی حرکت کریں گے۔

مجھے بے اختیار وہ زمانہ یاد آ گیا جب میں بھی فلمیں دیکھا کرتا تھا۔ آہاہا۔ کیا وقت تھا۔ آنجہانی سہگل کی دھوم تھی لوگ ان کی غزلوں پر سر دھن ڈالتے تھے۔ کیا آواز پائی تھی ظالم نے۔ بابل مورا نیہر چھوٹا جائے...... اور یہ آج کل کے گویّے...... یہ کیا جانے گانا کس چڑیا کا نام ہے۔ گاتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے غرارہ کررہے ہیں اور اب تو ایسے ایسے گانے رائج ہیں جن کا نہ کوئی مطلب ہے نہ معنی۔

کل ہی کا ذکر ہے بیرسٹر صاحب کا نوکر کریم ایک گانا گارہا تھا۔ ''رم پم پوں رم پم پوں'' ...... پہلے تو میں سمجھا کہ یہ کار کے ہارن کی نقل کررہا ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ یہ کسی فلم کا گانا ہے ہارن کی نقل نہیں ہے۔ گانا ہندوستانی ہے مگر دھن انگلستانی ہے۔ یعنی دوغلا گانا ہے۔ کیا کیا لوگ ہیں اس زمانے میں۔ انگریزوں کو گالیاں دیتے ہیں مگر اس کی نقل کرکے فخر محسوس کرتے ہیں۔

(ہفت روزہ ''دُنیا'' لکھنؤ۔ ۲۸ر نومبر ۱۹۵۸ء)

......☆......

لکھنوی تہذیب کی ایک جھلک

کہتے ہیں کہ زمانہ بدل گیا۔ ارے زمانہ کہاں بدلا، لوگ ضرور بدل گئے ہیں۔ آخر ہم

بھی تو زمانہ کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ ہم نے تو اپنی روش نہیں بدلی۔ جیسے پہلے تھے سو اب بھی ہیں۔ یہ آج کل کے لڑکے نہ جانے کیا کیا لباس پہن رہے ہیں۔ رنگ برنگ کے بلاؤز نما تنگ شرٹ پہن کر حضرت گنج میں گجنگ کرتے ہیں۔ جیسے یہ ان کے دادا پردادا سے ورثے میں ملی ہو۔ ارے خدا کی مارا ایسے لباس پر جس سے مرد، مردنہ نظر آئے۔ میرے پڑوس میں ایک صاحب رہتے ہیں۔ ان کا لڑکا شاید نویں کلاس میں پڑھتا ہے۔ مگر صاحب جس قدر وہ بناؤ سنگار میں وقت لگاتا ہے، اگر اتنا وقت اپنی زندگی سنوارنے میں لگاتا تو اس کی زندگی بن گئی ہوتی ...... مگر اس کو اس کا کیا غم۔ باپ کماتا ہے اور برخوردار رنگین لفافے بدل کر حضرت گنج کی سیر کرتے ہیں۔

لیجئے اس پر کل کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ کل جمعہ کا دن تھا اور لوگ نماز کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سردی اپنے عروج پر تھی۔ سردی اور وہ بھی نومبر دسمبر کے مہینے کی۔ خدا کی پناہ۔ ہاتھ پیر برف کی مانند جمے جا رہے تھے۔ سوچا کہ آج چل کر امین آباد کی مسجد میں نمازِ جمعہ اَدا کروں۔ چوراہے پر مجھے اپنے پرانے دوست احمد کلیم کا لڑکا احمد مبین نظر آ گیا۔ بڑا سلیم الطبع لڑکا ہے۔ میں نے دیکھا اس قدر ٹھنڈک میں وہ ایک باریک کرتا اور پاجامہ پہنے نماز پڑھنے جا رہا تھا۔ سردی سے بچنے کے لئے اس نے ایک گرم شال کندھے پر ڈال لی تھی۔ مبین کے لباس کو دیکھتے ہی دل باغ باغ ہو گیا۔ سوچا کہ یہ بھی تو اسی زمانہ کا جوان ہے۔ اگر چاہتا تو بلاؤز پہن کر گھوم سکتا تھا۔ جی چاہا کہ اس کو گلے لگا لوں۔ مگر پھر چوراہے کا خیال آتے ہی رُک گیا۔ میں نے اس کو روک کر قصداً کہا "میاں مبین ...... آج تم نے میرا دل خوش کر دیا۔ تمہارے اس لباس کو دیکھ کر تو مجھے نواب آصف الدولہ کا زمانہ یاد آ گیا۔ کیا زمانہ تھا...... شام کو امین آباد میں کرتے ہی کرتے نظر آتے تھے۔ اب تو جیسے لوگوں نے اودھ کی قدیم روایات کو طاق پر رکھ دیا ہے۔ بیٹا تم کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ اب بھی ہمارے لکھنؤ میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو پرانی روایات کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ اللہ تمہیں سلامت رکھے"۔

(ہفت روزہ "دُنیا" لکھنؤ۔ ۲ ستمبر ۱۹۵۸ء)

بدل جاتی ہیں تقدیریں

ماڈرن شو کمپنی کے مالک شاہد بھائی بہت ہی نیک انسان ہیں۔ لاکھوں کروڑوں کا کاروبار۔ مگر تعلیم کے معاملہ میں زیرو۔ میں نے محسوس کیا کہ بھلے شاہد تعلیم کے زیور سے محروم رہ گئے ہوں مگر ان کے اندر اچھی باتوں کو سننا اور اس پر عمل کرنے کا بے پناہ جذبہ ہے۔ ایک دن برسبیل تذکرہ میں ان سے امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ مشہور واقعہ بیان کر رہا تھا کہ حضرت عمرؓ جو بادشاہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اپنی داڑھی پکڑ کر کہا کرتے تھے کہ اے عمر......! غریب اور مفلس عمر، بکریاں چرانے والا عمر، تو آج امیر المومنین بنا بیٹھا ہے۔ اپنے پچھلے دنوں کو یاد کر کہ تیرے پاس پہننے کے لئے کپڑے نہیں تھے اور کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ خدا کا شکر ادا کیا کر کہ اس نے پورے ملک کا بادشاہ بنا رکھا ہے۔ اپنے ماضی کو یاد کر کے اللہ تبارک وتعالیٰ کا انتہائی شکر ادا کر۔ تو کیا تھا اور اللہ نے تجھے کیا بنا دیا۔ اپنی رعایا کا ہر طرح کا خیال رکھنا تیرا پہلا فرض ہے۔ اکثر اپنی داڑھی پکڑ کر روتے تھے۔

ایک عرصہ کے بعد جب میں عمرہ کر کے واپس لوٹا اور شاہد بھائی کے نیاز حاصل کرنے ان کے دولت خانہ پر پہنچا تو یقین مانئے حیرت سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ دیکھ کر کہ شاہد بھائی اب باریش مومن بن چکے تھے۔ ماشاء اللہ خوبصورت گول چہرہ پر کالی داڑھی سے چہرہ کی رونق دوبالا ہو گئی تھی۔

میں نے پوچھا:

''شاہد بھائی......! اچانک آپ کی شخصیت ماشاء اللہ بارونق کیسے ہو گئی''؟

''اب کیا بتاؤں حاجی صاحب! یہ سب آپ کی ذات کا کرشمہ ہے''۔ انہوں نے جواب دیا۔

''میری ذات کا کرشمہ......شاہد......میں سمجھا نہیں''۔ حاجی صاحب نے پوچھا۔

'اس لئے کہ ہر نیک کام میں آپ کا ہاتھ غیر ارادی طور پر ہی صحیح ہوتا ضرور ہے''۔

''اچھا......اب میاں شاہد تم بھی......نخاس کے بدتمیزوں کے کہنے میں آ گئے''۔ حاجی صاحب نے خفگی سے کہا۔

''ایسی بات نہیں ہے حاجی صاحب۔ میری زندگی میں اچانک تبدیلی حضور آپ ہی کے دم سے ہوئی ہے''۔ شاہد نے کہا۔

''شاہد......تم کو میں بہت اچھا سمجھتا تھا''۔

میں تو شہر میں بھی نہیں تھا عمرہ کرنے گیا تھا جہاں میں مکّہ اور مدینہ شریف کی رونقوں سے فیضیاب ہو رہا تھا۔

اپنے ملک، اپنے شہر اور تمام مسلمین اور مسلمات کے حق میں نیک دُعائیں مانگ رہا تھا۔ حرم کے کھمبے کو پکڑ کر گڑگڑا کر رو رہا تھا اور تم کہتے ہو کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ بہت اچھا ہوا۔ میرا دل خوشی اور مسرت سے سرشار ہو گیا۔ مگر میں درمیان میں کیسے آیا...... یہ تو بتاؤ۔ حاجی صاحب نے پوچھا۔

''حاجی صاحب...... آپ خود اپنے جملہ سے پکڑ گئے۔ حرم شریف کے کھمبوں کو پکڑ کر روئے اور اللہ نے آپ کی دُعا سن لی اور میں شیطان سے انسان بن گیا''۔ شاہد نے کہا۔

''اچھا......وہ کیسے''؟ حاجی صاحب نے پوچھا۔

''چچا...... حقیقت یہ ہے کہ مردم شناسی کی بے پناہ صلاحیت آپ کے اندر موجود ہے۔'' شاہد نے کہا۔

''تو اب شرافت سے اصل مدّے پر آؤ۔ بہت سن چکا تمہاری چرب زبانی۔ بتاؤ کہ یہ تبدیلی کیسے آئی''؟ حاجی صاحب نے پوچھا۔

''حاجی صاحب''......شاہد نے کہا۔

''جی کہئے''......حاجی صاحب نے جواب دیا۔

''میری زندگی میں جو تغیر آپ دیکھ رہے ہیں اس کی ایک الگ داستان ہے''۔

’’سنائیے وہ داستان...... میں بھی سنوں وہ داستان جس کی وجہ سے آپ کی شخصیت میں یہ تبدیلی آئی ہے‘‘۔ حاجی صاحب نے کہا۔

’’تو سنئے...... شاید آپ کو علم نہ ہو کہ میں بے حد غریب اور مفلس تھا۔ والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک چھوٹے سے کچے کھپریل کے مکان میں ضعیف نانی کے ساتھ رہتا تھا۔ گھر کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ بوڑھی نانی کچھ سلائی وغیرہ کر کے کسی طرح میری پرورش کر رہی تھیں۔ مالی حالت اتنی خراب تھی کہ کبھی کھایا اور کبھی بغیر کچھ کھائے ہی سو گئے۔ مفلوک الحال نانی کے پاس دو پیسے نہیں تھے کہ وہ حجام سے میرے بال کٹواتیں۔ لہٰذا جس قینچی سے سلائی کرتی تھیں اسی سے میرے بال اپنے ضعیف ہلتے ہوئے ہاتھوں سے کاٹتی تھیں جس سے میرے سر پر سیکڑوں کی تعداد میں قینچی سے کٹنگ کے داغ صاف نظر آتے تھے جسے دیکھ کر محلے کے لڑکے تالیاں بجاتے تھے، میرا مذاق اُڑاتے تھے اور میں نانی کی گود میں سر رکھ کر خوب روتا تھا۔ اپنی مفلسی پر بھی رونا آتا تھا‘‘۔ اتنا کہہ کر شاہد بھائی تھوڑی دیر کی لئے رُک گئے۔

’’پھر کیا ہوا‘‘؟ حاجی صاحب نے پوچھا۔

’’پھر...... نانی کے انتقال کے وقت میں جوان ہو چکا تھا۔ میں نے ایک چھوٹی سی دُکان چپلوں جوتوں کی کھولی اور نانی مرحومہ کی دُعاؤں سے چند سالوں میں، میں شہر کا سب سے بڑا تاجر ہو گیا۔ جوتوں کے ہول سیل کاروبار سے دن دوگنی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی اور آپ کی دُعا سے ڈیڑھ سو ملازم مختلف دُکانوں پر لگے ہوئے ہیں‘‘۔ شاہد پھر رُک گئے۔

’’اماں میاں...... شاہد یہ تو بتاؤ کہ تمہاری داڑھی کا جوتوں سے کیا تعلق ہے‘‘۔ حاجی صاحب نے پوچھا۔

’’قبلہ حاجی صاحب...... آپ کے عمرہ پر جانے کے بعد ایک روز مجھے شیو کرانا تھا۔ لہٰذا میں شہر کے سب سے مشہور ایئر کنڈیشن ہیئر کٹنگ سیلون میں چلا گیا۔ باربر نے مجھے پچاس ہزار روپے کی قیمتی کرسی پر بیٹھا کر جیسے ہی داڑھی پر خوشبودار قیمتی کریم لگایا، میں ماضی میں کھو گیا......

آپ کا سنایا ہوا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ یاد آ گیا کہ وہ اپنی داڑھی پکڑ کر روتے تھے کہ اسلام سے قبل تم بکریاں چرایا کرتے تھے، تم کو کوئی پوچھتا نہیں تھا۔ آج امیر المومنین بنے بیٹھے ہو''۔

بس پھر کیا حاجی صاحب...... ''میں سوچنے لگا کہ شاہد تم وہی شاہد ہو کہ تمہاری نانی کے پاس دو پیسے نہیں تھے کہ وہ حجام سے میرے بال کٹوا سکتیں اور آج تم ایئر کنڈیشن سیلون کی قیمتی کرسی پر شیو کرانے بیٹھے ہو۔ بس میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت نوازا ہے، اس کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔ لہٰذا میں بغیر شیو کرائے واپس چلا آیا اور اس چہرہ پر اُسترہ حرام قرار دے دیا گیا''۔

''شاہد...... تم نے بڑی نصیحت آمیز واقعہ سنایا''۔ حاجی صاحب نے کہا۔

''انشاء اللہ...... اس واقعہ کو سن کر بہتوں کو سبق حاصل ہوگا اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق ہوگی''...... اللہ تمہیں سلامت رکھے۔

......☆......

مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور عروج

حاجی صاحب نے مسلمانوں میں تعلیم کی کمی کی جو وجوہات بیان فرمائیں اسے ہم مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی پر ایک عالمانہ گفتگو کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ حاجی صاحب نے فرمایا کہ ملک کی آزادی اور خاتمۂ زمینداری کا سب سے منفی اثر ہندوستانی مسلمانوں پر پڑا، جس کی سب سے بڑی آبادی زمیندارانہ نظام پر منحصر تھی۔ زمینداری کے خاتمہ کے بعد مسلمان زمیندار دو طبقہ میں بٹ گئے۔ اس کا ایک طبقہ تعلیم کے خلاف ہو گیا۔ لڑکیوں کو ناظرہ قرآن شریف اور بہشتی زیور تک تعلیم دی اور ان کا نکاح کر کے رخصت کر دیا گیا۔ لڑکوں کے لئے زمین جائیداد ہے، پڑھ کر کیا کلکٹر بنیں گے۔ دس بارہ کلاسیں پڑھا کر کسی بھی محکمہ کے بڑے سے بڑے سرکاری افسر سے کہہ کر نوکری دلوا دی۔ سرکاری نوکری کو فخریہ تسلیم کرتے تھے، خواہ وہ چپراسی ہی کی کیوں نہ ہو۔ اپنے بچوں کو رزیل بچوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنا ان کی شان کے خلاف تھا۔

''حاجی صاحب'' میں نے پوچھا: ''کیا ان بڑے بڑے زمینداروں کو تعلیم سے دلچسپی نہ تھی یا وہ سرکاری نوکری کے دیوانے تھے''۔

''دلچسپی تو دُور کی بات، تعلیم کی اہمیت کو ہی وہ نہیں سمجھتے تھے۔ دس کلاس کے بعد کسی اعلیٰ سرکاری افسر کے آگے زبان کھولی اور نوکری آپ کے قدموں کے نیچے''۔

''اتنے بڑے بڑے اور باعث فخر زمیندارانہ شان وشوکت کے مالک اسے معیوب نہیں سمجھتے تھے''؟ میں نے کہا۔

''اماں میاں اچھو...... معیوب کو مارو گولی۔ اسے وہ فخر سمجھتے تھے اور رئیسوں کی بڑی بڑی مجلسوں میں فخریہ بیان کرتے تھے کہ ماشاء اللہ میرا بیٹا ریلوے میں ٹکٹ کلکٹر ہو گیا ہے''۔

''مبارک ہو نواب صاحب، مبارک ہو۔ انشاء اللہ ایک دن وہ کلکٹر بھی ہو جائے گا''۔

سارے بگڑے رئیسوں نے ایک ساتھ بھونڈا قہقہہ لگا کر مبارک باد دی۔

''یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے''۔ اچھو میاں نے حاجی صاحب سے کہا۔

''افسوس اور ندامت کی بات تھی مگر فخریہ بیان کیا جاتا تھا جنہیں واقعی پڑھ لکھ کر کلکٹر بننا چاہئے تھا وہ ریلوے کے ٹکٹ کلکٹر بن گئے''۔

حاجی صاحب خود تو زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے، مگر تعلیم کی افادیت اور اہمیت کو بہت اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ حاجی صاحب نے بتایا کہ اسی زمانہ میں ایک بڑے زمیندار اور شہر کے معروف ترین وکیل نے اپنے رسوخ کو استعمال کر کے اپنے دس کلاس پاس بیٹے کو محکمہ ٹرانسپورٹ (روڈویز) میں بس کنڈکٹر کی نوکری دلوادی، جسے ان کے لڑکے نے جوائن کر لیا مگر وہ اس نوکری کی مخالفت اور آگے پڑھنے کی ضد کرتا رہا۔ آخر کار وکیل صاحب نے اپنے بیٹے کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ لڑکے نے بی. ایس. سی۔ ایم. ایس. سی۔ اور میڈیسن میں پی. ایچ. ڈی کی اعلیٰ ڈگری حاصل کر کے خاندان کا نام روشن کیا۔ ہندوستان کی نامی گرامی مرکزی حکومت کی میڈیکل یونیورسٹی سے پروفیسر کے عہدے سے نوکری سے سبکدوش ہوا، ورنہ تیس سال کنڈکٹری کر کے

روڈویز کے ٹرافک انسپکٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہو جاتا۔

’’حاجی صاحب...... آپ نے شروع میں فرمایا تھا کہ زمینداروں کا دوسرا طبقہ تعلیم سے دلچسپی رکھتا تھا‘‘؟

’’دیکھو برخوردار...... چھوٹے اور متوسط درجہ کے زمینداروں نے سوچا کہ زمین جو ایکڑ میں نہیں بلکہ بیگھے میں ہے۔ یعنی کم ہے، چند سالوں میں کھا پی کر برابر ہو جائے گی۔ لہٰذا تعلیم کی دولت جو کبھی ختم نہ ہونے والی ہے اسے حاصل کرنے کے لئے گھر کا غلہ اور دس بیس روپیہ لے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی چلے گئے وہ اور ان کی نسلوں نے تعلیمی اعتبار سے عروج پر پہنچ کر ڈاکٹر، انجینئر، اور بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کیں اور ملک اور بیرون ملک میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ اپنا اور اپنے خاندان کا نام روشن کیا۔ آج ان کا نام نہایت احترام اور عزت سے لیا جاتا ہے۔ اہل خاندان ان پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

زمینداری اور تعلیمی سرگرمیوں کی تفصیلی حالات لکھنے کا میرا مقصد نہ کسی کی بڑائی مقصود ہے اور نہ کسی کو ہتک پہنچانے کا ارادہ ہے۔ میرے لکھنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ جو نسل پچاس ساٹھ سال پہلے گھر کا غلہ اور بیس پچیس روپیہ اور گھر کے دھلے دو جوڑے کرتا پاجامہ لے کر تعلیم حاصل کرنے کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی چلی گئی ہوتی تو قوم کی تعلیمی پسماندگی کا آج رونا نہ رونا پڑتا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اس زمانہ میں پچیس روپیہ مہینہ میں ناشتہ اور دونوں وقت بکرے کا گوشت ملتا تھا، جبکہ آج کل سات سو روپے ماہوار میں بغیر ناشتہ کے دونوں وقت بھینسے کا کالا کالا گوشت اور تندور کی ڈنلپ روٹی ملتی ہے۔

افسوس تو مجھے اس بات کا ہے کہ جس ملک میں جامعہ اردو علی گڑھ جیسا تعلیمی ادارہ ہو وہاں کا مسلم طبقہ علم سے بے بہرہ رہ جائے۔ اچھو میاں تم تو جانتے ہو کہ تمہارے حاجی چچا نے آزادی کے دس سال بعد ریلوے جوائن کیا تھا۔ اس زمانہ میں میرے ریلوے کے دفتر کے رفیق احمر لاری اور اشفاق حسین صدیقی نے ہمت سے کام لیا۔ جامعہ اُردو علیگڑھ سے ادیب کامل کی

سند حاصل کر کے ریلوے کی نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی چلے گئے جہاں سے انہوں نے ایم.اے اور پی.ایچ.ڈی کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر پروفیسر احمر لاری گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر کی نوکری سے سبکدوش ہوئے۔ ڈاکٹر اشفاق حسین صدیقی نے شبلی نیشنل ڈگری کالج اعظم گڑھ میں درس وتدریس میں شعبۂ اُردو کے صدر تک ترقی کی اور پروفیسر کی حیثیت سے نوکری سے سبکدوش ہوئے۔ افسوس کہ تمہارے حاجی چچا کے دونوں دوست اب اس دنیا میں نہیں رہے"۔

"حاجی صاحب...... پھر آپ کیوں نہیں گئے علی گڑھ"۔ اچھو میاں نے دریافت کیا۔

"بیٹا اچھو' حاجی صاحب نے جواب دیا۔ "یتیم ہونا دنیاوی نقطہ نظر سے اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے۔ مگر میری نظر میں تو یہ پیارے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ جو میں نے پانچ سال کی کم عمری میں اَدا کی۔ دینی نقطۂ نظر سے یہ بہت بڑے فخر کی بات ہے مگر دُنیاوی نقطۂ نظر میں سب سے مظلوم یتیم ہے،، جس کے سر پہ پیار وخلوص سے ہاتھ پھیرنا بھی ثواب میں شامل ہے۔

بس بیٹے علی گڑھ جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کرنے میں میری یتیمی کا بہت بڑا رول ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر یتیم پیدا کرے تو حضرت ابو طالب جیسا سرپرست بھی عطا فرمائے۔

......☆......

طنز و مزاح

قصہ الیکشن میں کھڑے ہونے کا

مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ میرے مرحوم والد صاحب نے میری فلم بینی، آوارہ گردی اور جھوٹ بولنے سے تنگ آ کر ایک دن فرمایا تھا اگر میں اسی طرح زندگی بھر جھوٹ بولتا رہا تو یقیناً ہی ایک نہ ایک دن کسی سیاسی پارٹی کا لیڈر بن جاؤں گا۔ کیونکہ سیاست ہی تم جیسے بدمعاشوں کی آخری پناہ گاہ ہوتی ہے۔ ایک طویل عرصہ تک میں سوچتا رہا کہ مجھ میں آخر وہ کون سی نایاب خوبیاں موجود ہیں، جو مجھے ملک کا ایک سیاسی لیڈر بنا سکتی ہیں۔ لہٰذا ایک دن ڈرتے ڈرتے میں نے ان سے پوچھا:

''ابا جان! میری کن خوبیوں کی بنیاد پر آپ مجھے سیاسی لیڈر بننے کی نیک دُعائیں دیتے رہتے ہیں''؟

جواب میں انہوں نے (اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) سیاسی رہنماؤں کی جو خوبیاں بیان کیں وہ کسی کو بھی حیرت اور تجسس میں مبتلا کرنے کے لئے کافی تھیں۔

سیاسی لیڈر بننے کی ان خوبیوں کے باوجود مجھ میں ایک بہت بڑی کمی تھی اور وہ تھی کہ میں پاگل نہ تھا اور مرحوم والد صاحب کے مطابق ایک اچھے اور کامیاب سیاسی لیڈر کے لئے ضروری ہے کہ وہ کچھ دنوں کے لئے کسی اچھے پاگل خانہ میں علاج بھی کروا چکا ہو۔

میری حالت بالکل اس گدھے جیسی تھی جو اس امید پر جی رہا تھا کہ اس کا دھوبی ایک نہ ایک دن اپنی خوبصورت بیٹی کی شادی اس سے کر دے گا۔ کیونکہ دھوبی جب بھی تاڑی پی کر اپنی بیٹی کی ڈنڈوں سے پٹائی کرتا تو ہمیشہ کہا کرتا کہ ''گھبرا مت، سور کی بچی، میں بہت جلد تیری شادی

کسی گدھے سے کر کے نکال باہر کروں گا''۔

میری حالت بھی اس گدھے سے بہت مشابہ تھی۔ کیونکہ میں بھی اس بیچارے معصوم گدھے کی طرح اس امید پر جی رہا تھا کہ راشن کا پچاس فیصدی گیہوں اور پچاس فیصدی کنکڑ کھا کر یقیناً کسی دن پاگل ہو جاؤں گا اور پھر اس کے بعد مجھے لیڈری مفت ہاتھ آ جائے گی۔

آخر کار وہ خوش نصیب دن بھی آ گیا جس کا مجھے برسوں سے انتظار تھا اور جس کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی حسرت لئے میرے والد صاحب اس دُنیا سے چلے گئے۔ یعنی مجھے پاگل قرار دے دیا گیا۔ مجھے اس الزام میں پاگل خانہ بھیج دیا گیا کہ میں آزاد شاعری کو بنا ٹائر اور ٹیوب کی سائیکل سے تشبیہ دیتا ہوں اور ماڈرن آرٹ کو کسی شرارتی لڑکے کی کارستانی تصور کرتا ہوں۔ میری کسی نے ایک نہ سنی اور مجھے پاگل خانہ میں ڈال دیا گیا۔ لہٰذا میں تین مہینہ پاگل خانہ میں رہ کر جب باہر نکلا تو مکمل لیڈر بن چکا تھا۔ کیونکہ اب میری تقریریں اوٹ پٹانگ ہونے لگی تھیں اور عوام مجھے لیڈر ہی نہیں بلکہ فلاسفر بھی سمجھنے لگے تھے۔ کیونکہ عام طور پر میری تقاریر ان کی سمجھ سے باہر تھیں۔

پاگل خانہ سے واپس آنے پر سوائے یہ سوچنے کے میرے پاس کوئی کام نہیں تھا کہ میں وہاں کیوں گیا تھا۔ کیا میں صرف اس لئے پاگل ہو گیا تھا کہ آزاد شاعری اور ماڈرن آرٹ میری ناقص عقل کی سمجھ سے باہر کی چیزیں تھیں...... آخر ہر پاگل کی طرح اس نتیجہ پر پہنچا کہ میں پاگل نہیں ہوا تھا بلکہ مجھے پاگل سمجھنے والے پاگل ہیں...... کئی ماہ کی مسلسل بیماری، بے روزگاری اور فاقہ کشی کے نتیجہ میں، میں نے الیکشن لڑ کے کا وہ تاریخی فیصلہ لے لیا جس نے مجھے زندگی کی اہم اور عظیم تجربات سے روشناس کرایا...... الیکشن لڑنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ بہت ممکن تھا کہ الیکشن سے دستبردار ہونے کے لئے کوئی پارٹی دس بارہ ہزار روپے کی تھیلی پیش کر دے اور میری بے روزگاری دُور ہو جائے۔ لہٰذا میں نے خدا کا نام لیا اور محلّہ کے حاجی جمن سے الیکشن کے کاغذات بھروا کر الیکشن آفس میں جمع کر دیا اور اس کی منظوری کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔

حاجی جمن کو آپ نہیں جانتے۔ اس لئے آپ سے ان کا تعارف کرانا ضروری سمجھتا ہوں۔ حاجی صاحب میرے محلے کے واحد ایسے شخص ہیں جو انگریزی میں آئے تار اور اُردو میں لکھے خط کو ہجے کر کے آسانی سے پڑھ لیتے ہیں۔ اسّی سالہ جمن نے اپنی ایک آنکھ سے ایک زمانہ دیکھا ہے۔ ان کی ایک آنکھ نقلی ہے اور پتھر کی بنی ہوئی ہے، جسے وہ پانی سے بھرے گلاس میں سرہانے رکھ کر سوتے ہیں۔

قصہ مشہور ہے کہ ایک بار غلطی سے رات میں پانی کے ساتھ وہ اپنی آنکھ بھی پی گئے تھے۔ حاجی صاحب بڑے تجربہ کار اور جہاں دیدہ بزرگ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر شخص اچھے بُرے وقت میں ان سے صلاح لینا اپنا اوّلین فرض تصور کرتا ہے۔

جب میں الیکشن کے کاغذات لے کر حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ اپنی نقلی آنکھ کو شیشے کے پیالے میں رکھ کر صابن سے دھونے کی تیاری کر رہے تھے۔ انہوں نے بڑے جوش سے میرا استقبال کیا اور سامنے بیٹھا کر میرے اوپر اپنی ایک نظر کا فوکس ڈالا، جیسے دریافت کر رہے ہوں...... ''کہو بیٹا...... کیسے تشریف لائے''۔

میں نے آرام سے بیٹھتے ہوئے کہا'' چچا جان! دُنیا میں ہر مشکل کا کوئی نہ کوئی آسان حل ہے''۔

''جیسے نور چشم'' حاجی صاحب نے پوچھا۔

''جیسے خدا کو پانے کے لئے عبادت کرنی چاہئے اور اگر آسانی سے مرنے کی خواہش ہو تو سرکاری اسپتال کی دوا پینی چاہئے اور گھٹ گھٹ کر مرنا ہو تو کلرکی کرنی چاہئے......''

''بجا فرمایا...... مگر تمہارے کہنے کا مطلب کیا ہے''؟

''مطلب یہ ہے کہ جب دُنیا میں ہر مشکل کا کوئی نہ کوئی آسان نسخہ ہے تو پھر الیکشن جیتنے کا نسخہ کیوں نہیں ہے''؟

''ہے......'' حاجی صاحب نے جواب دیا۔'' اس کا بھی بہت آسان نسخہ ہے''۔

''وہ کیا''؟

''وہ یہ کہ امیدوار کا چناؤ نشان اتنا جاذبِ نظر اور معنی خیز ہونا چاہئے کہ نگاہ پڑتے ہی امیدوار کی پوری شخصیت نظروں کے سامنے آجائے......''

''تو پھر کوئی اچھا سا چناؤ نشان میرے لئے بھی تجویز کیجئے''۔

''مثال کے طور پر'' انہوں نے کہنا شروع کیا...... ''اگر تم اپنا چناؤ نشان ''گھاس کھاتا ہوا گدھا'' رکھ لو تو تمہاری کامیابی کے امکانات بہت بڑھ جائیں گے۔ کیونکہ تمہارا چناؤ نشان تمہاری عظیم شخصیت اور اپنے مالک سے وفاداری کا زندہ ثبوت ہوگا۔ دیکھنے میں بیوقوف نظر آنے والا یہ اکلوتا شریف اور مہذب جانور ہے۔ جب تم یہ اعلان کردو گے کہ تم اوّل نمبر کے گدھے ہو، تمہاری اس اعلیٰ ظرفی اور جرأت سے متاثر ہو کر لوگ تمہیں ووٹ دینے کے لئے سر پر پیر رکھ کر بھاگے آئیں گے''۔

''واہ چچا جان......'' میں نے خوش ہو کر کہا ''کیا لاجواب مشورہ آپ نے دیا ہے''۔

یہی نہیں برخوردار...... اس کے علاوہ تمہاری سو فیصدی کامیابی کی اور بھی وجہیں ہیں۔

''وہ کیا؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''پاگل خانہ کے ڈاکٹر کی جانب سے جاری کیا ہوا سرٹیفکٹ تمہاری کنویسنگ میں تُرپ کے پتے کا کام کرے گا جس میں اس حقیقت کی سرکاری طور پر تصدیق کی گئی ہے کہ تم دماغی طور پر صحت مند ہو۔ اس طرح کی سند تمہارے علاوہ کوئی پیش نہیں کر سکے گا۔''

''بہت خوب! والد صاحب مرحوم نے درست فرمایا تھا کہ لیڈر بننے سے قبل پاگل خانہ کی سیر ضروری ہے۔ میں اب واقعی اپنے والد صاحب مرحوم کی دانشمندی اور اپنی بیوقوفی کا قائل ہو گیا''۔

''بس تو، بیٹے باندھ لنگوٹی اور کود پڑ الیکشن کے میدان میں''۔

''مگر......'' میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''چچا جان...... الیکشن لڑنے کے لئے سب

سے بڑا مسئلہ پیسے کا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں میرے آنجہانی والد صاحب قبلہ نے وراثت میں ایک دیوار گھڑی، دو ٹیبل لیمپ اور بے شمار قرضدار چھوڑے ہیں۔ گھڑی اور لیمپوں کو ملا کر ان کی کل قیمت باون روپے دس پیسے ہوتی ہے۔ اس لئے ایسی صورت میں......"

"میں سمجھ گیا......" انہوں نے درمیان ہی میں کہا۔ "پیسہ نہیں تو آدمی کولہو کا بیل ہے۔ تمہارے الیکشن کے لئے چندہ اکٹھا کر سکتا ہوں بشرطیکہ تم مجھ سے ایک معاہدہ کر لو"۔

"میں آپ کا ہر حکم ماننے کا وعدہ کرتا ہوں۔ آپ حکم کریں"۔

"تم اس بات کا وعدہ کرو کہ اگر تم الیکشن میں کامیاب ہو جاتے ہو اور تمہاری پارٹی کی حکومت بن جاتی ہے تو تم کفن پر کنٹرول لگوا دو گے......"

"کمال ہے! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ چچا جان؟......

"چینی پر کنٹرول، غلّے پر کنٹرول، کپڑوں پر کنٹرول، مطلب یہ کہ ماچس کی ڈبیہ اور مٹی کے تیل پر کنٹرول تو سنا تھا۔ مگر کفن پر کنٹرول......اس سے بھلا قوم کا کیا فائدہ ہوگا"۔

"قوم کا فائدہ ہو یا نہ ہو۔ تمہارے الیکشن پر لگائی ہوئی رقم کا ہزار گنا فائدہ مجھے ضرور ہوگا"۔

"وہ کیسے......"؟ میں نے پوچھا۔

"بھئی......اب تک کے تجربات سے ہم نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جس اشیاء کی قیمت میں اضافہ کرنا ہو اس پر سرکاری کنٹرول لاگو کر دیا جائے، اب ضروری اشیاء میں کفن ہی کنٹرول سے مبرّا ہے۔ جس پر کسی طرح کا کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ لہٰذا سرکار اگر آرڈی نینس جاری کر دے کہ کفن کا کپڑا صرف ان ہی دوکانوں سے خریدے جائیں جن کے پاس سرکاری پرمٹ یعنی لائسنس ہو۔ عام دوکانوں سے خریدے ہوئے کفن میں دفنائے یا جلائے جانے پر سرکار مرحوم کے قانونی وارث کو غیر قانونی قرار دے گی۔ برخوردار!! ظاہر ہے کہ وعدہ کے مطابق پوری ریاست کے لئے ایسا سرکاری لائسنس کا صرف میں ہی حقدار ہوں گا"۔

''واہ چچا جان واہ! حقیقت میں آپ کو تو پلاننگ کمیشن کا چیئرمین ہونا چاہئے تھا''۔

قصہ کوتاہ کہ میں نے بڑی شان کے ساتھ الیکشن میں حصہ لیا، جس پر بقول حاجی صاحب، ہزاروں روپے خرچ ہوئے۔ سو کمبل، پانچ سو موٹر ٹائر کی بنی چپلیں اور ایک ہزار مرغی کے چوزے غریبوں میں مفت تقسیم کیے گئے۔ اس کے علاوہ الیکشن کی کنویسنگ کے لئے دو سو سائیکلیں بانٹی گئیں۔

ایک مہینہ تک، دن رات کی دوڑ دھوپ اور دُھواں دھار تقاریر کے باوجود جب الیکشن کا نتیجہ نکلا تو میں تین دن تک بے ہوش پڑا رہا۔ کیونکہ میرے اکلوتے حریف نے مجھے ایک لاکھ ووٹوں سے زبردست شکست دے دی تھی اور مزے کی بات یہ تھی کہ میں نے جس حلقہ سے الیکشن لڑا تھا اس کے کل ووٹروں کی تعداد بھی ایک لاکھ تھی۔

میں اب بھی جب کبھی اپنی شکست پر غور کرتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ کیونکہ حاجی صاحب کے ہزاروں روپیوں کے علاوہ میری جیب سے بھی تیرہ روپے ساٹھ پیسے خرچ ہوئے جس کا مجھے بیحد افسوس ہے۔

(سریتا۔ نئی دہلی۔ ۲/ مارچ ۱۹۶۸ء)

......☆......

ناک کا بال

سہیل جیسے ہی رائل کیفے میں داخل ہوا، سب کی نگاہیں اس کی طرف اُٹھ گئیں۔ اس کے ساتھ شہر کے سب سے بڑے رئیس سیٹھ کرامت حسین کی لڑکی نزہت کو دیکھ کر لوگ ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے۔ سہیل نزہت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک عجیب تمکنت سے چلتا ہوا ہال کے ایک گوشے کی میز پر بیٹھ گیا۔ آرکسٹرا کی مدھم سروں پر کوئی انگریزی گانے کی دُھن ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیاں کافی کی چسکیوں کے درمیان گفتگو میں مہو تھے۔ مگر سہیل کے آتے ہی جیسے سب کی باتوں کا اختتام ہو چکا تھا۔ سبھی خاموش ہو گئے اور سب کی نگاہیں اس میز کی طرف بار بار اُٹھ رہی تھیں جہاں سہیل اور نزہت مسکرا مسکرا کر گفتگو کر رہا تھا۔ قریب کی میز پر بیٹھے ہوئے ایک لڑکے نے اپنی دوست سے سرگوشی کی۔

''ناہید...... تم نے اسے پہچانا''؟

''ہاں...... اس نے ایک دونوں کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ مگر تعجب ہے کہ کرامت حسین جیسے صاحب حیثیت کی لڑکی سہیل کے ساتھ ہے''۔

''میں خود حیران ہوں''۔ لڑکے نے کچھ اور آگے جھکتے ہوئے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''یہ وہی سہیل ہے، جس کے پاس کل پہننے کیلئے کپڑے اور فیس جمع کرنے کے لئے پیسے نہیں تھے''۔

''مجھے معلوم ہے......'' ناہید نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''دونوں کے اندازِ گفتگو سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے نزہت نے سہیل کو کافی لفٹ دے رکھی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے''؟

''ہاں...... میں بھی دیکھ رہا ہوں...... یہ کمبخت سہیل ہے ہی اسی قسم کا...... جس سے دوستی کرتا ہے اور دوست اگر صاحب حیثیت ہو، تو پھر ناک کے بال کی طرح چپک جاتا ہے''۔

دونوں کی گفتگو یہیں پر ختم ہوگئی۔ کیونکہ سہیل اور نزہت کیفے کے صدر دروازے کی طرف جا رہے تھے۔

سہیل اس دُنیا میں بالکل تنہا تھا۔ ماں کے پیار سے محروم، باپ کی شفقت اور محبت سے بے نیاز اس کی زندگی اندھے کنویں کی طرح خشک اور تاریک تھی۔ خوشی کی لذت سے ناآشنا گمنامی کی زندگی گزار رہا تھا۔ مگر اس میں ہمت اور استقلال کا جذبہ تھا اور اس کے دل میں امیدوں کے بے شمار دیئے روشن تھے۔

اس کو حسین اور درخشندہ مستقبل کی آمد کا انتظار تھا۔ اسی لئے اس نے اپنی پڑھائی جاری رکھی تھی جبکہ حالات بالکل اجازت نہیں دے رہے تھے کہ وہ یونیورسٹی کے اخراجات پوری کر سکے مگر اس کی لگن کو دیکھ کر وہ رئیس لڑکے جن کو خود پڑھنے میں دلچسپی نہیں ہوتی، مگر وہ کمزور لڑکوں کی مدد کر کے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ لہٰذا اس کی فیس کے علاوہ کتابوں کا بوجھ ایسے ہی نیک اور فراخ دل طلباء نے اٹھا رکھا تھا۔ سخت محنت اور قربانیوں کے بعد اس نے اپنی تعلیم مکمل کر لی اور اب وہ خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر کچھ کرنا چاہتا تھا۔

ان ہی دنوں وہ ایک حادثہ کا شکار ہوگیا۔ امین آباد سے حضرت گنج کی طرف جاتے ہوئے لال باغ کے چرچ کے پاس وہ سیٹھ کرامت حسین کی کار کے نیچے آ گیا۔ کرامت حسین کروڑ پتی تھے اور انتہائی رحم دل اور غریب پرور واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے فوراً سہیل کو میڈیکل کالج میں داخل کرایا اور شہر کے چوٹی کے ہڈی کے ڈاکٹروں کی زیرِ نگرانی اس کے فریکچر کا علاج کرایا اور سہیل بہت کم وقت میں صحت یاب ہوگیا۔ سیٹھ کرامت حسین اسے اسپتال سے ڈسچارج کرا کر اپنی کوٹھی میں لے آئے۔

سہیل ایک ہفتہ تک ایک خوبصورت کمرے میں درجنوں خادموں کی دیکھ بھال میں رہا۔ اسے وہاں ہر طرح کا آرام میسر تھا۔ ایک ہفتہ کے بعد کھانے کی میز پر سیٹھ صاحب نے سہیل سے کہا:

"میرا خیال ہے کہ اب آپ اچھے ہیں"۔

''جی ہاں...... خدا کا شکر ہے اور آپ کا احسان ہے، ورنہ آج نہ جانے......''

''احسان......'' کرامت حسین اس کی بات کاٹتے ہوئے بولے۔''احسان اس پاک پروردگار کا ہے جس نے تمہاری جان بچائی۔ اتنا کہہ کر وہ چند لمحوں کے لئے رُک گئے۔ خشک وتر میوے کھاتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

''آپ کے والدین آپ کے لئے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ انہیں بہت پہلے ہی اس حادثہ کے بارے میں مطلع کر دینا چاہئے تھا۔ اب آپ انہیں بتا دیں کہ سب خیریت ہے''۔

سہیل کے چہرہ پر اُداسی کی ایک گہری لہر دوڑ گئی۔ اس نے اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو سنبھالا اور بولا۔

''آپ کو سن کر افسوس ہوگا کہ میں اس دُنیا میں اکیلا ہوں''۔

''کیا......''؟ سیٹھ کرامت حسین کے منھ کا انگور اچانک حلق کے نیچے اُتر گیا۔ سہیل نے ایک فساد کے دوران پورے خاندان کے قتل عام کا دردناک واقعہ بیان کیا۔ اس کا بچ جانا ایک معجزہ سے کم نہیں تھا، کیونکہ اس وقت وہ گھر پر نہیں تھا۔ سہیل جب خاموش ہوا تو سیٹھ کرامت حسین کی آنکھوں میں ہمدردی کے آنسو تیر رہے تھے۔ سہیل نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا۔

''میں ایم.اے. کر چکا ہوں۔ اب نوکری کی تلاش کروں گا''۔

''اب تم کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے''۔ سیٹھ کرامت حسین اتنا کہہ کر اپنے کمرہ میں چلے گئے۔

سہیل کو سیٹھ کرامت حسین کے یہاں رہتے ہوئے کئی ماہ گزر چکے تھے۔ وہ اب گھر کے ایک اہم فرد کی حیثیت کی طرح رہ رہا تھا۔ اس نے سیٹھ صاحب کی فیکٹری کی اوپری دیکھ بھال بھی شروع کر دی تھی۔ مگر سیٹھ صاحب اسے کسی اعلیٰ عہدہ پر دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی اکلوتی بیٹی نزہت کے لئے سہیل سے زیادہ موزوں لڑکا نہیں مل سکتا جو ان کی موت کے بعد ان کی ساری جائیداد کا بخوبی انتظام کر سکے۔ نزہت ہی تمام جائیداد کی اکلوتی

وارث تھی اور سیٹھ صاحب کو کسی ایسے سلیم الطبع تعلیم یافتہ اور با اخلاق لڑکے کی تلاش تھی جو نزہت کے ساتھ رہ کر تمام کاروبار کو سنبھال سکے۔

سہیل نے ایک زمانہ کے بعد آرام کا منہ دیکھا تھا۔ سیٹھ صاحب کی بے لوث محبت اسے اپنے ماضی کی جانب اُڑا لے جاتی اور وہ گھنٹوں اپنے باپ کی محبت کو یاد کرتا۔

سیٹھ صاحب کی نزہت بہت پیاری لڑکی تھی اور سہیل سے کافی متاثر بھی تھی۔

دونوں کے مزاج میں یکسانیت کی وجہ سے بہت جلد وہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ ساتھ ساتھ کلب جانا، ہوٹلوں اور بازاروں کا چکر لگانا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر گھنٹوں خوش گپیاں کرنا، ان کا روز کا معمول بن گیا تھا۔ ایک دن سیٹھ صاحب نے سہیل کو اپنے خاص کمرے میں بلایا۔

''میں نے تمہارے لئے نیوی میں ایک اعلیٰ افسر کے عہدہ کے لئے گفتگو کر لی ہے۔ تم خان صاحب سے جا کر مل لو۔ کیونکہ وہ بھی سلیکشن بورڈ کے ممبر ہیں''۔

''بہت اچھا......'' اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''اور ہاں...... نیوی میں بہت چست اور چالاک نوجوان لئے جاتے ہیں۔ تم کچھ دنوں کے لئے یہ شیروانی وغیرہ اُتار پھینکو...... سمجھے''۔

''بہت اچھا''۔

''اور...... نزہت کے ساتھ مارکیٹ چلے جاؤ اور اپنے لئے دو تین سوٹ کے لئے قیمتی کپڑے لیتے آؤ۔ یہ سنہری موقع ہے شاید پھر آئے نہ آئے''۔ اچھا اب تم جا سکتے ہو۔

سہیل جب کمرہ سے نکلا تو انتہائی خوش تھا۔ اس نے فوراً نزہت کو یہ خوش خبری سنائی اور اسے لے کر مارکیٹ چلا گیا۔ وہاں سے واپسی پر وہ خان صاحب کے نیاز حاصل کرنے چلا گیا۔ جو سیٹھ کرامت حسین کے خاص دوست تھے۔ انہوں نے سہیل کو یقین دلایا کہ یقیناً اس کا اپائمنٹ ہو جائے گا۔ آج زندگی میں پہلی بار اس نے سوٹ پہنا تھا۔ ہمیشہ ڈھیلی ڈھالی شیروانی

میں خود کو بہت چست اور چالاک محسوس کرتا تھا، مگر آج وہ سوٹ پہن کر کریز کے ٹوٹنے کے خوف سے مرا جا رہا تھا اور ان لوگوں کو گالیاں دے رہا تھا جنھوں نے سوٹ کے ساتھ ساتھ اس کمبخت کریز کو ایجاد کیا تھا۔ کسی طرح قہر اُجبر اُاس نے گھر سے باہر قدم نکالا۔

انٹرویو میں صرف دو افراد تھے جن کے سوالات کا سہیل پورے اعتماد کے ساتھ صحیح صحیح جواب دیتا رہا۔ ممبران میں خان صاحب کے علاوہ ایک یوروپین افسر تھا۔ جس کی آنکھیں بڑی چمکیلی تھیں اور پچاس سال کی عمر ہونے کے باوجود بیس بائیس سال کے نوجوان کی طرح چست دکھائی دے رہا تھا۔ انٹرویو بہت کامیاب رہا۔ سبھی کو اُمید تھی کہ وہ لے لیا جائے گا، مگر جب نتیجہ نکلا تو سہیل کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ ناکام ہو گیا تھا۔ مایوسی کے عالم میں وہ خان صاحب کے پاس پہنچا۔

''سر میرا انٹرویو تو بہت اچھا ہوا تھا مگر'' ...... وہ آگے کہتے کہتے رک گیا۔

''ہاں ...... بیشک تمہارا انٹرویو اچھا ہوا اور میں نے دبی زبان میں مسٹر میکالف سے سفارش بھی کر دی تھی''۔ خان صاحب نے سہیل سے کہا۔

''پھر ...... پھر ...... آخر کیوں نہیں لیا گیا''؟ اس نے گھبرا کر سوال کیا۔

''بات یہ ہے مسٹر سہیل ......! یہ یوروپین آفیسر ڈسپلن کے بڑے پابند ہوتے ہیں۔ تم کو صرف اتنی سی بات پر نہیں لیا گیا کہ تمہاری ناک کا ایک بال باہر نکلا ہوا تھا......''!!

''کیا......'' سہیل نے تقریباً چیخ کر کہا اور اس کا ہاتھ بے اختیار اپنی ناک پر چلا گیا۔

خان صاحب نے کہا۔ ''تمہاری ناک کا ایک بال باہر نکلا ہوا تھا جو تہذیب کے خلاف ہے......''

سہیل نے ایسا محسوس کیا جیسے ساری دُنیا کی ناک کا بال اس کی ناک میں گھس گیا ہو۔ اس کا سر چکرانے لگا اور آنکھوں کے سامنے ہزاروں ''ناکیں'' گردش کرنے لگیں۔

......☆......

(ہفت روزہ ''دنیا'' لکھنؤ۔ ۴؍مارچ ۱۹۶۱ء / ماہنامہ ''لاریب'' لکھنؤ۔ اگست ۲۰۱۲ء)

یادوں کے چراغ

''آیا......'' انور نے اپنے کمرہ سے آیا کو پکارا۔
''جی سرکار......'' آیا نے دروازہ پر کھڑے ہو کر پوچھا۔
''یہ شور کیسا ہو رہا ہے''؟
''سرکار...... پڑوس میں جو بابو رہتے ہیں...... وہ'' ۔آیا کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔
''ہاں ہاں...... پڑوس میں کمار کانت رہتے ہیں۔ کیا ہوا ان کو''؟ انور نے بے چینی کے عالم میں پوچھا۔
''ان کی بیوی کا ابھی انتقال ہو گیا...... بیچارے دھاڑیں مار مار کر رو رہے ہیں'' ۔ آیا نے جواب دیا۔
''کیا...... ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا......'' انور گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اور پھر وہ بے اختیار سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

آیا جا چکی تھی۔ کمرہ میں وہ تنہا تھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کے کانوں میں بے شمار سیٹیاں بج رہی ہوں۔ دماغ پر کوئی ہتھوڑے چلا رہا ہے۔ وہ بدستور سر پکڑے صوفہ پر بیٹھا رہا۔ اس کی ویران نظریں میز پر رکھے ہوئے گلاس پر جمی ہوئی تھیں۔ میز کے ہلنے سے گلاس کا پانی چھلک رہا تھا۔ اس کی نظریں پانی کے اندر کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ وہ کچھ سوچنے لگا۔ کمار کانت کی بیوی کے انتقال کی خبر سن کر آج ایک مدت کے بعد اسے اپنی بیوی کی موت کی یاد آ گئی۔ اسے اپنی گزشتہ زندگی کی یادوں کے چراغ جلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ماضی کی پرچھائیاں جھلملانے لگیں اور اس نے محسوس کیا کہ جیسے پانی کی سطح پر اس کی مرحوم بیوی صوفیہ کا حسین چہرہ اُبھر آیا ہو۔ وہ

صوفہ سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا اور سوچنے لگا۔

دس سال قبل...... جب وہ اور صوفیہ ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ صوفیہ اس کی دُور کی رشتہ دار تھی۔ اس کے چہرہ کا رنگ بالکل سرخ وسفید تھا۔ اکہرا بدن، گھنے لمبے بال، بڑی بڑی عنابی آنکھیں اور سب سے کشش انگیز اس کے بائیں گال کا تل تھا جو اس کے حسن میں چار چاند لگا رہا تھا۔ اس تل کے بارے میں یہ روایت تھی کہ یہ صوفیہ کو ورثہ میں ملا ہے۔ کئی پشتوں سے یہ تل اس خاندان کا ساتھ دے رہا تھا۔ انور سیدھا سادہ نوجوان تھا۔ جو صوفیہ کی شرارتوں سے بہت گھبراتا تھا۔ صوفیہ اس کو پریشان کرنے کے نئے نئے منصوبے بنایا کرتی تھی۔

ایک روز جب انور کالج سے واپس آیا تو اپنے کمرہ میں داخل ہوتے ہی اس کا پارہ ایک سو ایک ڈگری تک چڑھ گیا۔ کتابیں اٹھا کر اس نے ایک کونے میں پھینک دیں۔ اور سر پکڑ کر اپنی اس حسین تصویر کا حشر دیکھنے لگا جو اس نے حال ہی میں کھنچوائی تھی۔ تصویر فریم کی ہوئی میز پر بدستور رکھی ہوئی تھی مگر اس میں بہت کچھ ترمیم کی گئی تھی۔ سر پر گول ٹوپی، بڑی سی داڑھی، آنکھوں پر عینک اور شیروانی میں گلاب کے پھول کی جگہ پر مسجد کا لوٹا لٹک رہا تھا۔ انور نے اپنی تصویر کا یہ حشر دیکھا تو اس کا دماغ گرم ہو گیا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ یہ صوفیہ کی شرارت ہے۔ وہ دوڑتا ہوا نیچے اُتر آیا۔

''خالہ بی...... خالہ بی'' وہ چلاتا ہوا باورچی خانہ کی طرف بڑھا۔

''ارے کیا ہے...... کیوں آسمان سر پر اٹھا رہے ہو''۔ خالہ بی وہیں سے بولیں۔

''میں کہتا ہوں...... صوفیہ کہاں ہے''؟ انور نے بہت غصہ میں کہا۔

''ارے کیا ہوا......؟ بکس سے کچھ غائب ہے'' خالہ بی نے پوچھا۔

''خالہ بی...... اتنی اچھی میں نے ایک تصویر کھنچوائی تھی۔ صوفیہ نے اس کا ستیاناس کر دیا''۔ انور نے کہا۔

''ارے ہوا کیا......'' خالہ بی نے گلوری منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''خود چل کر دیکھ لیجئے''۔ انور خالہ بی کو پکڑ کر اوپر کمرہ میں لے آیا۔ خالہ بی کی نظر جب اس کی تصویر پر پڑی تو وہ بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں۔ خالہ بی نے صوفیہ کو صلواتیں سنانی شروع کیں۔ اتنے میں صوفیہ داخل ہوئی۔ انور نے قہر آلود نظروں سے اُسے دیکھا۔

''لیجئے نواب صاحبہ آ گئیں''۔ انور نے خالہ بی سے کہا۔ ''صوفیہ...... یہ تو نے بنایا ہے'' خالہ بی مسکراہٹ کو دبا کر مصنوعی غصہ میں بولیں۔

''کیوں کیا بُری ہے''؟ صوفیہ نے بہت معصوم صورت بنا کر کہا۔ بات یہ ہے اماں بی ...... میرا دل چاہتا ہے کہ انور بھائی جلدی سے داڑھی وغیرہ بڑھا کر ملاّ بن جائیں اور خیر سے حج کے مبارک سفر کو روانہ ہو جائیں۔ صوفیہ نے کہا اور اُلٹے پاؤں بھاگی۔

وقت کی رفتار کے ساتھ صوفیہ کی شرارتوں میں سنجیدگی آنے لگی۔ انور نے اس کی چنچل آنکھوں میں محبت کے پیغام پڑھے اور وہ بے اختیار اس کو دل دے بیٹھا۔ صوفیہ کی مسکراہٹوں کو اس نے اپنی زندگی کا حاصل سمجھا۔ صوفیہ نے انور کو اپنے من مندر کا دیوتا مانا اور دونوں نے ایک دوسرے کو اپنا جیون ساتھی بنانے کا عہد کیا۔ کچھ ہی دنوں بعد دونوں کی شادی ہوگئی۔

شادی دونوں کی زندگی میں بہار بن کر آئی۔ صوفیہ کی شوخیاں لوٹ آئیں، شرارتیں پھر واپس آ گئیں، دونوں ہنسی خوشی زندگی کی حسین راہوں سے گزرتے رہے۔ صوفیہ نے انور کی زندگی میں خوشیاں بکھیر دیں۔ انور صوفیہ جیسی فرماں بردار خلیق بیوی پا کر بے حد مسرور تھا۔ اس کی زندگی قابل رشک تھی۔

شادی کے ایک سال بعد گھر میں ایک نئے مہمان نے قدم رکھا۔ بچی کا نام نگہت رکھا گیا۔ صوفیہ اور انور نگہت کو پا کر بیحد خوش تھے۔ دونوں گھنٹوں بیٹھے نگہت کو کھلایا کرتے۔ نگہت نے ہو بہو اپنی ماں کی شکل پائی تھی۔ وہی رنگ، وہی ناک ونقشہ اور بائیں رخسار پر وہ تل جو اسے اپنی ماں سے ورثے میں ملا تھا۔

ایک دن انور نے صوفیہ سے کہا۔

''صفو...... نگہت ہو بہو تمہارے بچپن کی تصویر ہے......''

''اور کیوں نہ ہو...... اچھا ہوا جو آپ پر نہ پڑی...... لڑکی ذات ہے کہیں سگریٹ وغیرہ پینے کی بُری عادت لگ جاتی تو......''صوفیہ نے شوخی سے کہا۔

''اچھا جی...... تو اس کا مطلب ہے کہ وہ تمہارے نقش وقدم پر چلے گی...... خدا نہ کرے کہ ایسا ہو''انور نے صوفیہ کو تاؤ دلایا۔

''کیوں کیوں...... مجھ میں کیا کیڑے پڑے ہیں......''صوفیہ نے پوچھا۔

''کہیں تمہاری طرح اس نے بھی کسی کی تصویر میں ترمیم شروع کر دی تو مجبوراً اسی کے ساتھ بیاہنا پڑے گا''۔انور نے مسکرا کر کہا۔

''ہائے اللہ...... آپ کو بھی کتنی پُرانی پُرانی باتیں یاد ہیں''۔صوفیہ نے ہنس کر کہا۔

''کیوں نہ ہوں...... اسی نے تو ہماری زندگی میں ایک نئی روح پھونکی تھی''انور نے کہا اور اُٹھ کر اپنے کمرہ میں چلا گیا۔

صوفیہ کی حالت بڑی خراب تھی۔اس کے کمرے میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ڈاکٹر نے کہا تھا کہ صوفیہ کی حالت نازک ہے اور اس بار ولادت میں خطرہ ہے۔انور نے سنا تو جیسے سناٹے میں آ گیا۔اس کے دماغ میں طرح طرح کے شبہات چکر کاٹنے لگے۔اس نے خدا سے دُعائیں مانگیں کہ میری صفو اچھی ہو جائے گی تو میں بھوکوں کو کھانا کھلاؤں گا،ان کو کپڑہ بانٹوں گا۔

ڈاکٹر جا چکے تھے۔کمرہ میں صرف صوفیہ اور انور تھے۔ننھی نگہت صوفہ پر بیٹھی کھیل رہی تھی۔انور کی آہٹ پر صوفیہ نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔

''آپ آ گئے...... اچھا ہوا...... مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا''۔صوفیہ نے بہت درد بھری آواز میں کہا۔

''صفو...... تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔خدا کی ذات سے نا امید نہ ہو''۔انور نے اس کا

ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

''نہیں...... یہ سب بہلاوے کی باتیں نہ کیجئے...... مجھے ایک وعدہ دیجئے کہ میری نگہت کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی''۔صوفیہ نے کہا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو صفو...... تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی''۔انور کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں موتی چمکنے لگے۔

''ایک وعدہ اور دیجئے...... صوفیہ نے انور کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔وعدہ دیجئے کہ آپ میری یاد میں اپنی بقیہ زندگی برباد نہیں کریں گے...... آپ کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر لیں گے''۔

''صفو...... انور اتنی زور سے چیخا کہ ننھی نگہت ڈر سے رونے لگی اور اپنی ماں سے لپٹ گئی...... ''صفو...... یہ تم نے کیا کہا...... تم میرا امتحان لے رہی ہو...... یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا...... یہ وعدہ واپس لو...... میں اپنی نگہت کی زندگی کو دوبھر نہ ہونے دوں گا...... میں اسی کو دیکھ کر بقیہ زندگی گزار لوں گا...... یہ وعدہ واپس لو...... تم نے یہ کیا کہہ دیا...... صفو یہ کیا کہہ دیا......''انور صوفیہ کے ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا کر رونے لگا...... کمرے کے سکوت میں اس کی ہچکیوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

آخر کار صوفیہ انور اور نگہت کو روتا اور چیختا چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سو گئی۔وہ منظر بھی صبر آزما منظر تھا جب انور نگہت کو گود میں لئے صوفیہ کے جنازے کو پکڑے رو رہا تھا...... رو رہا تھا اور وعدے دے رہا تھا۔''صفو...... میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری نگہت کو کوئی تکلیف نہ ہوگی...... صفو...... ہم لوگوں سے کون سی غلطی ہوگئی کہ تم سب کو چھوڑ کر چلی گئیں...... بولو...... صفو جواب دو...... اب میرے کپڑوں کا کون خیال رکھے گا۔اب کون میرا دفتر سے واپسی پر انتظار کرے گا......''انور اسی طرح روتا رہا۔

انور خاموشی کا مجسمہ بنا بیٹھا ہوا تھا۔اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔میز پر رکھے ہوئے گلاس کا پانی چھلک رہا تھا۔پانی کی سطح سے صوفیہ کی خیالی تصویر غائب ہو چکی تھی، مگر

اس کی ویران آنکھیں گلاس پر جمی ہوئی تھیں۔ آج دس سال پہلے کے واقعات اس طرح یاد آرہے تھے جیسے یہ کل کا واقعہ ہو...... گزشتہ زندگی کی یادوں کے چراغ جل اٹھے تھے۔ ماضی کی پرچھائیاں جھلملا جھلملا کر ٹھہر چکی تھیں۔ اس نے جو وعدہ صوفیہ سے کیا تھا۔ اس پر بدستور قائم تھا۔ نگہت کو دیکھ کر ہی وہ جی رہا تھا...... نگہت سے گھنٹوں الٹی سیدھی باتیں کرتا رہتا۔ اس کے رخسار کا تل اسے اپنی صفو کی یاد دلاتا اور وہ بے اختیار نگہت کو سینے سے لگا لیتا۔

انور کی خاموشی اس وقت ٹوٹی جب نگہت دوڑتی ہوئی آئی اور اس کے گلے میں جھول گئی۔ ''پاپا...... پاپا...... کمار چاچا بہت رو رہے ہیں...... پپو کہہ رہا تھا کہ میری ماں مرگئی...... کیوں پاپا''؟ نگہت نے اتنی معصومیت سے سوال کیا کہ انور نے بے اختیار اسے سینے سے لگا لیا۔ اور رونے لگا۔

''نگہت...... میری بچی...... تجھ کو کوئی نہیں چھین سکتا...... تو میری زندگی ہے...... تو میری صفو کی تصویر ہے......

تجھ کو ہی دیکھ کر تو میں جی رہا ہوں، تو میری آنکھوں کی نور ہے...... میری نگہت......''

انور بہت دیر تک نگہت کو سینے سے لگائے صفو کی یاد میں روتا رہا۔

ماضی کی یادوں کے چراغ بھڑک اُٹھے تھے۔

(ہفت روزہ ''دنیا'' لکھنؤ۔ ۱۵ راگست ۱۹۵۸ء)

......☆......

بخیل کا عقدِ ثانی

کوئی بھی شخص پیدائشی کنجوس نہیں ہوتا بلکہ بچت کی عادت ڈالتے ڈالتے کنجوسی کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس غریب کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ وہ کنجوسوں کے زمرہ میں شمار کیا جانے لگا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ساری دُنیا میں جینے کا یہی طریقہ ہے جس پر وہ گامزن ہے۔

بچت کرنا ایک اچھی عادت ہے جس کی سرکاری طور پر بھی ترغیب دی جاتی ہے کہ آپ اپنے مستقبل کے لئے بچت کیجئے جو آپ کی زندگی کے آخری دنوں میں کام آئے گی۔ اس بات پر بھی زور دیا جاتا ہے کہ آپ اپنی اگلی نسلوں کے لئے بچت کیجئے تا کہ آپ ان کو اچھی اور معیاری تعلیم سے مزین کر کے ان کے مستقبل کو تابناک بنا سکیں۔

یہ ساری باتیں اچھی اور ضروری ہیں کیونکہ مجھے علم ہے کہ جن لوگوں نے اپنے مستقبل کے لئے کچھ نہیں بچایا وہ پریشان ہوئے۔ پیسہ بچانا اچھی بات ہے مگر پیٹ کاٹ کر بچت کرنے کا میں قائل نہیں ہوں۔ بچت کی عادت کو اپنی شخصیت کا جز نہ بننے دیں، کیونکہ اس بُری عادت سے گھریلو معاملات میں اختلافات کے دروازے کھلتے ہیں اور گھر کا ماحول اثر انداز ہوتا ہے۔ غیر ضروری بچت کا گھر کے ماحول پر اثر پڑتا ہے۔ کھانے پینے کی اشیاء کی بچت سے گھر کا پورا ماحول اثر انداز ہوتا ہے۔ سب کی سوچ میں تبدیلی آنے لگتی ہے۔ بچوں میں احساسِ کمتری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے بچوں کے مقابلہ وہ خود کو کمتر تصور کرنے لگتے ہیں جس کا اثر ان کی تعلیمی سرگرمیوں پر پڑتا ہے۔

اسلام نے بھی اعتدال سے خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اتنی نہ کنجوسی کرو کہ عزیز و

اقارب کی امداد نہ کرسکو اور نیک کام کرنے سے گریز کرنے لگو۔ اعتدال سے کام لو۔ بچت کی بہت زیادہ عادت بخل کی جانب لے جاتی ہے، جسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے سختی سے منع فرمایا ہے۔ اس بات کی سخت وعید آئی ہے کہ بخل سے کام نہ لو کیونکہ بخیل جنت میں نہیں جائیں گے۔

ایسے ہی میرے ایک دوست عبدالقادر صاحب ہیں جو انتہائی شریف اور صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں۔ بااخلاق اور محفل پسند شخصیت کے مالک ہیں اور سوسائٹی میں اپنے اعلیٰ اخلاق اور سرکار کے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہونے کی وجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ادبی مزاج کے مدنظر ہر مشاعرہ اور ادبی نشستوں میں ضرور مدعو کئے جاتے ہیں۔

ان کی بے شمار عادتوں میں ایک عادت بہت نمایاں ہے کہ وہ گھریلو سامانوں کی خریداری میں اس بات کا لحاظ رکھتے ہیں کہ غیر ضروری اخراجات سے پرہیز کیا جائے اگر چھوٹے سائز کے ٹوتھ پیسٹ سے ضرورت پوری ہوسکتی ہو تو بڑے سائز کو خریدنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح گھر کے دیگر اشیاء کی خریداری میں بھی ان کا اپنا علیحدہ نظریہ ہے، جو عام روش سے ہٹ کر ہے۔ مثلاً سبزی خریدنے کے لئے عموماً رات کے نو دس بجے کے بعد جاتے ہیں، جب ساری اچھی اور تازی سبزیاں فروخت ہو چکی ہوتی ہیں۔ بچی ہوئی سبزیاں انہیں سستی ہی نہیں بلکہ نصف نرخ میں مل جاتی ہیں۔

''سنئے......'' ایک دن ان کی بیگم نے کہا ''بچوں کو آج تروئی کھانے کی خواہش ہے......تروئی بچوں کو بیحد پسند ہے اور آپ کی بھی پسندیدہ سبزی ہے، مگر پتہ نہیں کیوں آپ اسے لاتے ہی نہیں''۔

''دیکھو بیگم......'' انہوں نے کہا ''یہی وہ سبزی ایسی ہے جس کو پکانے میں گیس بہت خرچ ہوتی ہے، کیونکہ اس میں پانی زیادہ ہوتا ہے اور دیر میں سوکھتا ہے''۔

''لاحول ولاقوۃ......'' ان کی بیگم خفا ہو کر بولیں ''یہ کیا بات ہوئی کہ ان میں پانی ہوتا ہے تو ہم اب سبزی بھی نہ کھائیں، پتہ نہیں آپ کی کنجوسی آپ کو کہاں تک لے جائے گی۔ میں تو

پریشان ہوگئی ہوں"۔

عبدالقادر صاحب کو سرکاری طور پر بہت بڑا بنگلہ ملا ہوا تھا، جس میں کئی کمروں اور برآمدوں کے علاوہ باہر بہت بڑا لان تھا، جس پر باقاعدہ لوہے کا ایک گیٹ لگا ہوا تھا اور پورا بنگلہ اونچی چہار دیواری سے فیصل بند تھا۔ ان کے دفتر کے دوسرے ساتھیوں نے اپنے لان میں خوبصورت گھاس کے ساتھ پھول پتے لگائے تھے۔ سیکڑوں کی تعداد میں ہر قسم کے قیمتی پھولوں سے سیکڑوں گملوں کو مزین کئے ہوئے تھے، گملوں کے پھولوں کی رونق سے لان کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے تھے۔ پھول پتوں سے شوق رکھنے والے حضرات جب ادھر سے گزرتے تو ان کی بے پناہ خوبصورتی دیکھ کر چند لمحوں کے لئے رُک جاتے اور کہتے...... "جناب آپ کا لان تو ماشاء اللہ دہلی کے مغل گارڈن کی طرح لگ رہا ہے"۔

"ارے نہیں...... کہاں راشٹر پتی بھون کا مغل گارڈن اور کہاں اس حقیر فقیر کا معمولی لان...... آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں"۔

اسی خوبصورت لان کے بغل میں عبدالقادر صاحب کا لان تھا، جس میں پھولوں کے بجائے ہر طرح کی سبزیاں لگی ہوئی تھیں۔ آلو، ٹماٹر، گوبھی، بیگن، بھنڈی، لوکی اور ہری دھنیا، ہری مرچ کے علاوہ پیاز بھی اُگی ہوئی تھی...... لوکیوں کا موسم تھا لہٰذا درجنوں کی تعداد میں ہری ہری لوکیاں لٹک رہی تھیں۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ عبدالقادر صاحب کی بیگم نے لوکی پکائی اور بچی ہوئی آدھی لوکی کچن میں رکھ دی۔ دوسرے دن وہ لوکی غائب تھی اور عبدالقادر کے پیٹ میں درد ہونے لگا کہ آدھی کٹی ہوئی لوکی کہاں چلی گئی؟ بیگم سے پوچھا تو انہوں نے کہا کام کرنے والی کو دے دیا، کیا کرتی رکھ کر...... لیکن کچھ دنوں بعد جب بیگم نے پھر لوکی گوشت پکانے کے لئے عبدالقادر صاحب سے لوکی مانگی تو پیڑ سے آدھی لوکی کاٹ کر لائے...... بیگم یہ دیکھ کر حیرت میں پڑ گئیں کہ آدھی لوکی کا کیا حشر ہوا۔ دیکھا تو آدھی لوکی پیڑ پر لٹکی ہوئی اپنی قسمت کو رو رہی تھی۔

"یہ کیا کیا آپ نے؟...... میری سمجھ میں نہیں آیا" بیگم نے پوچھا۔

''دیکھو...... اب کوئی پیڑ سے آدھی لوکی توڑ کر نہیں لے جا سکتا ہے۔

''ارے ایک لوکی کی قیمت ہی کیا ہے کہ آپ اتنی کنجوسی کر رہے ہیں۔ آج کل لوکیوں کا سیزن ہے، ہر طرف لوکی ہی لوکی دکھائی دے رہی ہے''۔

''ابا...... نئے کلاس کے لئے مجھے نئی کتابیں خریدنی ہیں پیسے دیجئے''۔ ان کی چھٹی جماعت میں پڑھنے والی پیاری بیٹی نصرت نے کہا۔

''دیکھو نصرت...... خوشی کی بات ہے کہ تم پانچویں کلاس پاس کر کے چھٹی کلاس میں چلی گئی ہو...... اس لئے جو لڑکی چھٹی کلاس پاس کر کے ساتویں میں چلی گئی ہے اس سے سکنڈ ہینڈ کتابیں خرید لو''۔ عبدالقادر صاحب نے اپنی بیٹی کو سمجھایا۔

''نہیں...... میں نئی کتابیں لوں گی''۔ نصرت ضد کرنے لگی۔

''دیکھو بیٹا...... جب آدھی قیمت میں ساری کتابیں مل جائیں گی تو پھر زیادہ پیسہ خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے دیکھو...... میں نے پوری زندگی پرانی اور مانگی ہوئی کتابوں سے پڑھائی کی۔ کبھی نئی کتابیں نہیں خریدیں...... اس لئے تم جیسے پانچویں میں فرسٹ آئی ہو...... انشاء اللہ چھٹی کلاس مین بھی اوّل آؤ گی۔

بیٹے نے جب بارہویں کلاس پاس کر لیا تو اس نے بی اے کے فارم بھرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اپنے ابو سے اس نے فیس جمع کرنے کے لئے جب پیسے مانگے تو عبدالقادر صاحب نے اس کو سمجھایا کہ بی اے کر کے کیا کرو گے۔ ہزاروں بی اے۔ ایم اے سڑکوں پر بیکار گھوم رہے ہیں۔

''لیکن ابو...... وہ ایڈمنسٹریٹو سرویز کے امتحان آئی اے ایس۔ آئی پی ایس کی تیاری بھی تو کر رہے ہیں''۔

''لیکن اس میں کتنے آئی.اے.ایس. یا آئی. پی.ایس. بن پاتے ہیں''۔ عبدالقادر صاحب نے اپنے بیٹے سے دریافت کیا تو ان کے بیٹے نے برجستہ جواب دیا۔

''مگر جو بنتے ہیں وہ وہی لڑکے ہیں جو سڑکوں پر بیکار گھوما کرتے ہیں''۔

عبدالقادر صاحب کے پیروں میں کنجوسی نے بیڑیاں ڈال دیں تھیں، وہ اپنی فطرت سے مجبور تھے۔ لہٰذا ایک ذہین اور مستقبل روشن کرنے والے لڑکے نے لوور ڈویزن کلرک کی نوکری جوائن کرنی پڑی، صرف اس لئے کہ اس کے والد دولت رہتے ہوئے خرچ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے مسلم معاشرہ میں بہت سے ایسے بچے ہیں جو مالی تنگی کی وجہ سے اپنی تعلیم کو آگے نہ بڑھا سکے۔

عبدالقادر صاحب کی بیگم جب بیمار پڑیں تو عبدالقادر صاحب نے سب سے پہلے ہومیو پیتھک علاج شروع کیا، کیونکہ ڈاکٹر صاحب سے ان کے قریبی تعلقات تھے، جب اس سے فائدہ نہیں ہوا تو شہر کے نامی گرامی حکیم صاحب کے زیر علاج رہیں۔ اتفاق کی بات کہ حکیم صاحب سے بھی ان کے بہت گہرے مراسم تھے مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کے مصداق حالت نازک ہونے لگی۔ کئی سالوں سے پیٹ کے مستقل اور غیر معمولی درد میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوئی۔ عزیز و اقارب، دوست واحباب سبھی نے کسی بڑے شہر کے ڈاکٹروں سے مشورہ لینے کی صلاح دی۔ مگر وہ حسب عادت ہر مشورہ پر خاموش ہو جاتے تھے۔ چپّی سادھ لیتے تھے جیسے کہ انہوں نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ وجہ صرف یہی تھی کہ بڑے شہر کے علاج کے لئے لمبے اخراجات پر ان کی نظر تھی۔

ان کا حال تقریباً اس سیٹھ ساہوکار کی طرح کا ہو گیا تھا جو بستر مرگ پر پڑا تھا اور اپنے منیجر سے پوچھ رہا تھا کہ میرے اچھے علاج پر کیا خرچ آئے گا۔ منیجر نے اندازاً ایک موٹی رقم بتا دی، تب سیٹھ نے دریافت کیا کہ میرے مرنے پر کیا اخراجات ہوں گے۔ منیجر نے جو رقم بتائی وہ علاج والی رقم کے نصف سے بھی کم تھی۔ تب پھر سیٹھ نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ مجھے مرنے دو...... علاج کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

آخر ایک دن مناسب علاج کے فقدان میں ان کی بیگم نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند

کرلیں اور ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سو گئیں۔ ان کے انتقال پر عام خیال یہ تھا کہ وہ عبدالقادر صاحب کی کنجوسی کی سولی پر چڑھ گئیں، اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ایمرجنسی میں لائی گئی مریضہ کے پچھلے میڈیکل رپورٹ اور نسخہ جات کا جب ڈاکٹروں نے مطالبہ کیا تو وہ خاموش ہو گئے۔ ریکارڈ مہیا کرنے سے اس لئے قاصر تھے کہ انہوں نے اپنی بیوی کا کبھی قاعدہ کا علاج ہی نہیں کیا تھا کہ اس کا ریکارڈ محفوظ رکھتے۔ لہٰذا پچھلے ریکارڈ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اچھے علاج کے فقدان کی وجہ سے آخر عبدالقادر صاحب کی بیگم جاں بحق ہو گئیں۔

بیوی کے انتقال کے کچھ دنوں بعد عبدالقادر صاحب ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ بچے بڑے ہو کر اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو چکے تھے۔ لق و دق کوٹھی میں اکیلے رہ کر تنہائی کا احساس ان کو کھانے دوڑنے لگا۔ بیوی کے غم کے ساتھ ساتھ ایک غم ان کو اور کھائے جا رہا تھا کہ ان کے انتقال کے بعد فیملی پنشن کسی کو نہیں ملے گی ختم ہو جائے گی جو ایک اچھی خاصی رقم ہے۔ ان کی نظر میں بیوی کے انتقال کے غم سے زیادہ فیملی پنشن کے نہ ملنے کا پیشگی غم تھا۔ ان کے مطابق لاکھوں روپیہ کا خسارہ تھا جس کا کسی طرح ازالہ کرنا اب ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ کیونکہ فیملی پنشن کی حقدار صرف بیوی ہوتی ہے جو قادر صاحب سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں۔ قانون کے مطابق ریٹائرمنٹ کے بعد عبدالقادر صاحب کو چالیس ہزار روپیہ ماہوار پنشن مل رہی تھی جو قانوناً ان کے انتقال کے بعد بند ہو جائے گی۔ انہوں نے اس بہت اہم مسئلہ پر کئی دنوں تک غور کیا۔ کئی دن کی عقل ریزی کے بعد انہوں نے اس کا جو حل نکالا وہ بہت ہی غیر معمولی اور حیرت میں ڈالنے والا تھا۔ وہ بات عام دماغ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے اپنی ایک عزیزہ کو بلایا اور ان کے آگے ایک تجویز رکھی:

''دیکھو فاطمہ...... میرا اب آخری وقت آ گیا ہے''۔

''ایسا نہ کہئے قادر انکل......'' فاطمہ نے کہا جو ان کی سب سے چھوٹی بیٹی کی ہم جماعت رہ چکی تھی۔

''یہ بات میں نہیں بلکہ میرا وہ ڈاکٹر کہہ رہا ہے جس کے میں زیر علاج ہوں''۔

''کیا کہا ہے اس نے''؟

''میرے کینسر کی میعاد چھ ماہ سے ایک سال تک کی ہے''۔عبدالقادر صاحب نے بتایا۔

''یہ تو بڑی تکلیف دہ بات ہے''۔فاطمہ نے افسوس کا اظہار کیا۔

''کوئی بات نہیں...... زندگی اور موت تو مالک کائنات کے ہاتھ میں ہے۔تم میری بات غور سے سنو...... مجھے چالیس ہزار روپے ماہوار پنشن ملتی ہے۔تمہاری آنٹی کے انتقال ہو جانے کی وجہ سے میرے مرنے کے بعد یہ پنشن بند ہو جائے گی جو بہت بڑا نقصان ہے۔آج وہ ہوتیں تو ان کو میرے بعد بیس ہزار روپیہ ماہوار پنشن ملتی اور سکون سے زندگی گذر جاتی''۔

''چچا جان...... یہ باتیں مجھے کیوں سنا رہے ہیں۔میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں...... میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتایئے''۔فاطمہ نے پوچھا۔

''فاطمہ......تم مجھ سے نکاح کر لو''۔

''کیا کہا......نکاح کر لوں...... چچا جان آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے''؟

فاطمہ اتنا سنتے ہی غصہ سے کھڑی ہو گئی۔''آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں آپ کی بیٹی سے بھی چھوٹی ہوں......بدقسمتی سے میں بیوہ ہو گئی''۔

''فاطمہ......تم نے میری پوری بات نہیں سنی اور خفا ہو گئیں۔میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر تم مجھ سے محض کاغذی اور قانونی نکاح کر لو گی تو میں اپنے محکمہ کو اپنے نکاحِ ثانی کے کاغذات جمع کر دوں گا۔قانونی طور پر اب میرے بعد بیس ہزار روپیہ مہینہ کی فیملی پنشن کی تم حقدار ہو گی۔تم خود غور کرو کہ اتنی بڑی رقم سے تم اپنے بچوں کو اچھی تعلیم اور پھر شادی بیاہ کر سکو گی''......عبدالقادر صاحب نے فاطمہ کو سمجھایا۔

''وہ تو ٹھیک ہے......مگر اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا انکل یہ تو بتایئے؟ فاطمہ نے دریافت کیا۔کیونکہ اس کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ چچا عبدالقادر بیحد کنجوس واقع ہوئے ہیں، بغیر

مقصد کے کوئی بات نہیں کرتے۔

''بتاتا ہوں...... بیس ہزار روپے کی فیملی پنشن کی رقم صرف دس سالوں میں تقریباً چوبیس لاکھ روپے ہوتی ہے۔ جس میں سے تم مجھے صرف چار لاکھ ابھی ادا کردو، پھر بھی میرے مرنے کے بعد تم کو بیس لاکھ روپے کا فائدہ ہوگا...... تم ابھی کم عمر ہو بہت ممکن ہے کہ جتنے سال میں نے نوکری کی ہے اس سے زیادہ تم پنشن لو...... اس پر غور کرو اور جواب دو''۔

فاطمہ تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ اس نے بی کام کیا ہوا تھا۔ دیر تک غور وفکر میں مبتلا رہی۔ حساب لگایا۔ تھوڑی سی ذہنی جوڑ گھٹاؤ کے بعد اس نے اعلان کردیا کہ ''میں تیار ہوں، اس کے لئے مجھے کیا کرنا پڑے گا''۔

''تمہیں کچھ نہیں کرنا ہے۔ نکاح کے بعد اس کی ایک کاپی میں اپنے آفس میں جمع کردوں گا جو جائز طریقہ سے محض ایک قانونی خانہ پُری ہوگی۔ اس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ میرے مرنے کے بعد قانونی طور پر تم بیس ہزار روپے ماہوار فیملی پنشن کی حقدار ہو جاؤ گی''۔

بدعنوانی کی یہ بالکل نئی ایجاد ہے۔ جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

......☆......
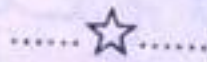
موبائل

قومی شاہراہ پر بہت بڑا حادثہ ہوا تھا۔ ایک ٹیکسی میں سوار بھی مسافر اس بھیانک حادثہ میں جاں بحق ہو گئے تھے جس میں ٹیکسی ڈرائیور بھی شامل تھا۔ قریب کے گاؤں کے لوگوں کا ایک جم غفیر جائے حادثہ پر فوری امداد پہنچانے کے لئے جمع ہو گیا۔ عام طور پر ایسے مواقع پر گاؤں کے افراد سرکاری عملہ کی آمد سے قبل امدادی کاموں میں جٹ جاتے ہیں۔ حادثہ کی جگہ پر مسافروں کا سامان بکھرا پڑا تھا جس میں بیگ، اٹیچی اور دیگر ضروری اشیاء شامل تھیں۔ ان ہی سامانوں کے درمیان کسی مسافر کا موبائل پڑا تھا۔ اس موبائل سے رِنگ ٹون کی آواز آنے لگی۔ ہر شخص اس موبائل کو حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا جس سے آواز آرہی تھی۔ مجمع سے کسی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اس بجتے ہوئے موبائل کو اُٹھالے۔ ہر شخص سہما ہوا ایک دوسرے کو تجسس کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ایک مقامی اخبار نویس رئیس احمد خاں نے موبائل کو اٹھایا اور ہیلو کہا۔ موبائل سے آواز آئی۔

''پوجا...... تم کتنی دیر میں فیض آباد پہنچ رہی ہو''؟

''صاحب...... آپ کون بول رہے ہیں''؟

''ارے...... تم کون بول رہے ہو...... یہ فون تم کو کہاں سے ملا؟'' کرخت آواز میں کہا گیا۔

''صاحب......'' کہہ کر تھوڑی دیر کے لئے رُک گیا اور سوچنے لگا کہ وہ کیسے کہے کہ یہ فون مجھے ان مسافروں کے سامان کے پاس سے ملا ہے جو حادثہ میں مارے جا چکے ہیں۔ وہ اس پورے واقعہ کو بتانے سے ہچکچا رہا تھا۔ اس نے پھر کہا۔

''صاحب......''

''کیا صاحب صاحب کی رٹ لگا رکھی ہے''۔ موبائل سے آواز آئی۔

اخبار نویس کو یہ مشکل درپیش تھی کہ وہ اس حادثہ کی خبر اس شخص کو کس طرح دے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس شخص کو کیسے جواب بتائے کہ یہ موبائل اس کو اس سڑک پر پڑا ملا ہے جس پر آج ایک بھیانک حادثہ ہوا ہے اور ٹیکسی میں سوار سبھی مسافر مارے گئے۔ ایسے مواقع پر دیہات کے لوگ فوراً جمع ہو جاتے ہیں۔ ان ہی دیہاتیوں میں وہ اخبار نویس بھی شامل تھا جس کو گرا ہوا موبائل ملا تھا۔ اخبار نویس کا بلا تاخیر جائے حادثہ پر پہنچنے کا ایک مقصد خبر اکٹھا کرنا بھی ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے مقامی اخبار ہی ان کا ذریعہ معاش ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اخبار نویسی کی بدولت ضلعی سطح پر اعلیٰ حکام تک ان کی بہ آسانی رسائی ہو جاتی ہے۔ چھوٹے موٹے مقامی مسئلوں کے لئے عوام ان ہی اخبار نویسوں کا سہارا لیتے ہیں۔ کوئی دنگا فساد ہو یا کوئی سرکاری مہم، افسران بھی دیہات کے ان اخبار نویسوں کی موجودگی کو یقینی بناتے ہیں تا کہ خبر کو عوام اور حکومت تک جلد از جلد پہنچایا جا سکے۔

''تم بولتے کیوں نہیں...... خاموش کیوں ہو گئے''۔ موبائل سے پھر وہی کرخت آواز آئی۔

''صاحب......'' اخبار نویس کے منہ سے صرف اتنا نکلا تھا کہ موبائل سے آواز آئی۔

''پھر تم نے صاحب صاحب کی رٹ لگا دی...... میں پوچھتا ہوں کہ یہ موبائل تم کو کیسے ملا''؟

''اب میں کیا بتاؤں صاحب'' اخبار نویس نے جواب دیا۔

''کیوں؟...... کیا تمہارے منہ میں زبان نہیں ہے''؟

اخبار نویس سوچنے لگا کہ اس کے منہ میں زبان تو ہے مگر وہ اس زبان سے کیسے کہے کہ جس کا وہ فیض آباد میں انتظار کر رہا ہے وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ دراصل یہ اخبار نویس خبریں

حاصل کرنے کے علاوہ عوام کے سچے ہمدرد بھی ہوتے ہیں۔ غریبوں اور مظلوموں کی مدد کرنا اپنا فرضِ اوّلین تصور کرتے ہیں۔ کبھی کبھی اپنے فرائض کی ادائیگی میں یہ اخبار نویس اپنی جان کی بازی تک لگانے سے گریز نہیں کرتے۔ ایک بار ایک اخبار کا نمائندہ ملک کے اعلیٰ سیاسی شخصیت کی فوٹو گرافی کرنے کے لئے ٹرین کی چھت پر چڑھ گیا جہاں سے وہ سیاسی لیڈر کی واضح عکاسی کر سکتا تھا مگر بدقسمتی سے وہ ٹرین کے اوپر لگے بجلی کے ہائی وولٹیج تار سے ٹکرایا اور پلیٹ فارم پر گرتے ہی ختم ہو گیا۔

''کیوں بھئی...... اب کیا ہو گیا...... خاموش کیوں ہو گئے۔ کیا سمجھتے ہو کہ چوری کئے ہوئے موبائل کو تم آسانی سے ہضم کر لو گے''۔ فیض آباد سے پھر ایک گرجدار آواز آئی۔

اخبار نویس نے سوچا کہ اس غریب شخص کو کیا پتہ کہ چوروں، رہزنوں اور سماج دشمن عناصر کے خلاف مہم چلانے کے عوض وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو گنوا چکا ہے ان کے خلاف مہم چھیڑنے کے بعد جب اس کو دھمکیاں ملنے لگیں کہ اپنے قلم کو لگام دو ورنہ اس کے اکلوتے بیٹے کو اغوا کر لیا جائے گا تو اسے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ سماج دشمن عناصر اپنی اس دھمکی کو عملی جامہ پہنانے سے گریز نہیں کریں گے۔ آخر ایک دن اس کے اکلوتے بیٹے کو اغوا کر لیا گیا۔ محکمہ پولیس کے تمام اعلیٰ حکام نے پورے علاقہ کی ناکہ بندی کر دی اور گھر گھر چھاپے مارے جانے لگے، مگر اغوا کے پانچویں دن بچے کی لاش قریب کے جنگل میں ملی اس حالت میں کہ اس کی گردن جسم سے جدا تھی۔ مگر اس اخبار نویس نے اپنے فرائض میں کوئی کوتاہی نہیں برتی اور اپنی مہم جاری رکھی۔ وہ کسی بھی ظلم اور زیادتی کے آگے خود سپردگی کا قائل نہیں تھا۔

زندگی میں کبھی کبھی ایسے مقام بھی آتے ہیں جب انسان کا ذہن کام نہیں کرتا۔ تھوڑی دیر کے لئے فیصلہ کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ آدمی چاہتے ہوئے بھی وہ کام نہیں کر پاتا جس کو وہ کرنا چاہتا ہے۔ بس ایسی ہی کچھ کیفیت اس اخبار نویس کی تھی جو چاہنے کے باوجود اس بات کا انکشاف کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ اتنی سی بات کہہ سکے کہ آپ جس کا انتظار

کررہے ہیں وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔اس کو اپنے اکلوتے بیٹے کی ناگہانی موت یاد آ گئی اور وہ سوچنے لگا کہ پتہ نہیں اس حادثہ میں مرنے والی پوجا کے کتنے بچے ہیں۔ان بچوں کو جب ماں کے گذر جانے کی دل دہلانے والی خبر ملے گی تو ان کا کیا حال ہوگا۔شاید وہ اتنا بڑا غم برداشت نہیں کر پائیں گے۔

بغیر ماں کے بچوں کی کیفیت سے وہ بہ خوبی واقف تھا اس کو آج بھی وہ دن یاد تھا جب زچگی کے دوران اس کی سگی بہن کا انتقال ہوا تھا۔اس حادثہ سے گھر کا ہر فرد مغموم تھا۔اتنے بڑے غم کو بھلانا آسان بھی نہیں تھا۔خاندان کے ہر شخص کو اس بات کا غم کھائے جا رہا تھا کہ دو سے آٹھ سال کے چار معصوم بچوں کی پرورش کیسے ہوگی۔دو سال کی بچی کسی غیر کے ہاتھ سے دودھ نہیں پی رہی تھی وہ صرف اپنی ماں کو تلاش کر رہی تھی۔چھ سال کا لڑکا رات میں چیخ کر اُٹھ بیٹھتا تھا کہ میں نہیں کھاؤں گا۔اخبار نویس اپنے بھانجے کو گلے لگا کر پوچھتا کیا ہوا بیٹا کیا نہیں کھاؤ گے۔وہ جواب دیتا ماموں، ممّی کہہ رہی تھی کہ آئس کریم نہ کھانا گلا خراب ہو جائے گا اور اسکول کا ناغہ ہوگا۔ اپنی ماں کو بھلانا ان ننھے بچوں کے لئے بہت ہی مشکل تھا۔وہ معصوم بچے اس حقیقت سے لاعلم تھے کہ اس کی ماں اب اس دنیا میں نہیں ہے اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔

''تمہاری خاموشی بتا رہی ہے کہ تم شرافت سے نہیں بتاؤ گے کہ یہ موبائل تم کو کہاں ملا'' موبائل سے آواز آئی۔''اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس فون کو سرویلانس پر ڈلوا کر معلوم کرلوں کہ تم کہاں چھپے ہوئے ہو، اس کے بعد لاکھ کوششوں کے باوجود تم بھاگ نہیں سکو گے''۔

''مجھے بھاگنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔اخبار نویس نے جواب دیا۔

''کیا کہا.....تم کو بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔کیا مطلب ہے تمہارا''۔موبائل سے آواز آئی۔

''دیکھیے بھائی صاحب.....آپ جو بھی ہوں میری بات کو غور سے سنیں.....آج لکھنؤ فیض آباد ہائی وے پر ایک بہت بڑا حادثہ ہوا ہے''۔

''کیا کہا حادثہ ہوا ہے......'' موبائل سے ایک چیخ کی آواز آئی۔

''جی ہاں......ٹیکسی میں سوار آٹھوں مسافر جاں بحق ہو گئے ہیں''۔

''مگر آپ کون ہیں؟ آواز آئی۔

''میں ایک اخبار نویس ہوں۔ جائے حادثہ پر دوسرے سامانوں کے ساتھ مجھے یہ موبائل پڑا ملا جسے رنگ آنے پر میں نے اسے اٹھالیا''۔

''جلدی بتایئے کہ اس کے بعد کیا ہوا؟'' گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

'آپ نے کسی عورت کا نام لیا تھا''۔

''ہاں ہاں'' گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ ''لکھنؤ سے پوجا آ رہی تھی''۔

''مجھے بتاتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ جس کا یہ موبائل ہے وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے''۔

''ایسا نہ کہیے بھائی صاحب''۔ رُک کر پوچھا گیا ''آپ کا شبھ نام''؟

''مجھے رئیس احمد خاں کہتے ہیں''۔

''پولیس ساری لاشوں کو فیض آباد لے کر جا چکی ہے، صدر اسپتال جایئے''۔

اتنا کہہ کر اخبار نویس رئیس احمد خاں نے فون کو بند کر دیا۔

پریشانی کے عالم میں گھبرایا ہوا ایک نوجوان فیض آباد کے صدر اسپتال پہنچا۔ اس کے ساتھ اس کے خاندان کے کئی افراد بھی تھے۔ پوجا پر جب اس کی نظر پڑی تو وہ خوش ہو گیا۔ وہ دوڑ کر اس نوجوان سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ اسپتال کے اسٹاف نے بتایا کہ یہ واحد مسافر ہیں جو اتنے بڑے حادثہ میں زندہ بچ گئی ہیں اور ان کو معمولی سی خراش تک نہیں آئی ہے۔

ایک بار پھر پوجا اس نوجوان سے لپٹ گئی۔ اتنے میں نوجوان کے موبائل کی گھنٹی بجی...... وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ پوجا کے موبائل سے کال آئی تھی۔ کسی نے اس کو آواز دی۔

''بھائی صاحب......ادھر دیکھئے......میں آپ کے پیچھے کھڑا ہوں''۔

''ارے رئیس بھائی......بھگوان کی کرپا سے پوجا بچ گئی۔ آپ کی مدد کے لئے میں بہت شکر گذار ہوں۔ مجھے منوج کمار کہتے ہیں''۔

''منوج کمار جی......یہ آپ کی؟'' اخبار نویس رئیس خاں نے پوچھا۔

''یہ......'' منوج کمار نے اس لڑکی پوجا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری منگیتر پوجا ہے......لکھنؤ یونیورسٹی سے کلاس کرکے واپس فیض آباد آ رہی تھی جب یہ حادثہ ہوا''۔

''چلئے......خدا کا شکر ادا کیجئے کہ آپ کی منگیتر کی جان بچ گئی''۔

''مگر......'' منوج کمار نے کہا ''مگر رئیس بھائی......اگلے مہینہ ہماری شادی ہونے والی ہے۔ آپ کو ہر حال میں آنا ہوگا کوئی بہانہ نہیں چلے گا اور ویسے بھی کیا آپ ہماری شادی کی خبر کو اخباروں میں شائع نہیں کریں گے کہ یہ شادی اسی خوش نصیب لڑکی کی ہو رہی ہے جو اتنے بڑے حادثہ میں صحیح سلامت بچ گئی تھی۔

''ضرور......ضرور آؤں گا......انشاء اللہ اگلے مہینہ ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ۔ کہہ کر اخبار نویس رئیس احمد خاں اسپتال کے صدر دروازہ سے باہر نکل گیا۔

......☆......

ہائے لکھنؤ

تہذیب وتمدن کی بات ہواور لکھنؤ کا ذکر نہ آئے یہ ناممکن ہے۔ لکھنؤ کی سرزمین قدیم زمانے سے اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتی ہے۔ اودھ کے اس شہر میں اتنی جاذبیت ہے کہ یہاں جو آیا وہ اس کی حسین شام کا اسیر ہو کر رہ گیا۔ اودھ کے اس خوبصورت شہر میں جو رونقیں ہیں وہ کسی اور شہر کو نصیب نہیں ہیں۔ یہاں کے نوابوں نے اسے خوب سے خوب تر بنانے میں بہت اہم کردار اَدا کیا ہے۔ ان کے تعمیر کردہ بڑا امام باڑہ، چھوٹا امام باڑہ، رُومی دروازہ اور شاہ نجف کا امام باڑہ قابل دید ہیں۔ نوابین اودھ کے دورِ حکومت کے بعد انگریزوں کی حکومت نے بھی لکھنؤ کی ترقی کے لئے بہت سے نئے نئے بازار، لڑکیوں اور لڑکوں کے اسکول قائم کئے جو آج ان کی یادگار اور لکھنؤ کی شان ہیں۔ ان معیاری اسکولوں کی دھوم بیرونی ملکوں میں بھی ہے، اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ان معیاری اسکولوں کے فارغین پوری دُنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔

لکھنؤ میں قیام پذیر شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس نے امین آباد، نظیر آباد، نخاس، چوک اور حضرت گنج کی سیر نہ کی ہو۔ ان تاریخی بازاروں کے ذکر کے بغیر لکھنؤ کا ذکر بے معنی ہے۔ امین الدولہ پارک جسے اب امین آباد کہا جاتا ہے، پوری دُنیا میں مشہور ہے۔ یوروپ کے ملکوں میں بھی امین آباد پارک اور بازار کا ذکر خیر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کے نخاس کے بازار کی بات ہی نرالی ہے۔ اس بازار کی خوبی یہ ہے کہ ہر اتوار کو ہفتہ وار بازار لگتا ہے جس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں پابندی کے باوجود چڑیوں کا بازار بھی لگتا ہے جس میں طوطے، مینا، تیتر، بٹیر، کبوتر وغیرہ فروخت ہوتے ہیں۔ گذشتہ زمانہ میں ایک روپیہ کی ایک بٹیر بکتی تھی جسے جاڑے کے موسم میں کثرت سے استعمال کیا جاتا تھا۔

نخاس کے بعد اگر چوک کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ لکھنؤ کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ چوک کا بازار قدیم زمانہ سے مشہور و معروف ہے، جہاں لکھنؤ کی بیگمات خریداری کرتی تھیں، آج بھی اس بازار میں بڑی رونق ہے۔ برقع پوش مستورات کی تعداد مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ لکھنوی مزاج کے لذیذ کھانا بنانے کے ماہرین نخاس کے باورچی ٹولہ میں رہتے ہیں۔ شادی بیاہ میں اسی محلہ کے باورچی بلائے جاتے ہیں، یہ خاندانی باورچی ہیں اور لذیذ کھانا پکانے کا ہنر ان کے خاندان میں پشت در پشت چلا آرہا ہے۔

ان ہی سب خوبیوں کے مدنظر منظور صاحب نے لکھنؤ شہر کو اپنا وطن ثانی بنانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے اپنا تبادلہ کرایا اور بیوی بچوں کو لے کر لکھنؤ آگئے۔ سستا زمانہ تھا، لہٰذا کم آمدنی میں بھی خوش اسلوبی سے زندگی بسر ہو رہی تھی۔ گرانی نے ابھی اپنے پاؤں نہیں پھیلائے تھے۔ اس لئے ہر چیز سستی تھی مگر روپیہ مہنگا تھا۔ ہر شخص کی قیمتی اشیاء خریدنے کی حیثیت نہیں تھی۔ کسی بیش قیمت چیز کو خریدنے کے لئے کئی مہینہ پہلے سے پلاننگ کرنی پڑتی تھی پھر بھی دو لڑکیوں، بیوی اور ضعیف والدہ پر مشتمل ان کی گرہستی بخوبی چل رہی تھی۔ بس ان کی والدہ کو صرف اس بات کا غم کھائے جا رہا تھا کہ منظور کے کوئی اولادِ نرینہ نہیں ہے صرف دو لڑکیاں ہیں۔ منظور صاحب نے اپنی ماں کو سمجھایا۔

''اماں......اب بیٹا بیٹی سب برابر ہیں''۔

''ارے ہٹو...... بیٹا اور بیٹی برابر کیسے ہو سکتے ہیں'' اماں نے کہا۔ ''بیٹے سے تو خاندان چلتا ہے......بیٹیاں پرایا دھن ہیں ایک دن اپنے گھر چلی جائیں گی......''

''ٹھیک ہے۔ اب دیکھئے جواہر لعل نہرو کے کوئی بیٹا نہیں تھا مگر پچھلے سو سال سے ان کا خاندان چل رہا ہے اماں......''

''ہاں......وہ تو ٹھیک ہے'' امان نے کہا۔

''اللہ تبارک وتعالیٰ جس کو چاہتا ہے بیٹا دیتا ہے جس کو چاہتا ہے تو صرف بیٹیاں دیتا

ہے۔ کسی کو دونوں یعنی بیٹا بیٹی دیتا ہے اور کسی کو کچھ بھی نہیں دیتا...... یہ سب اللہ کی مرضی ہے اماں'' منظور صاحب نے کہا ''وہ تو ٹھیک ہے مگر بیٹا تو ضعیفی کا سہارا ہوتا ہے، جب ماں باپ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو ان کی دیکھ بھال کرتا ہے''۔اماں نے کہا۔

''اماں ...... آج کے دور میں جن بیٹیوں کو نظر انداز کر کے بیٹوں کو خوب کھلایا پلایا جاتا ہے، پڑھا لکھا کر بڑا کیا جاتا ہے مگر وہ اچھے مستقبل کی تلاش میں بیرونِ ملک چلے جاتے ہیں اور بیٹیاں رہ جاتی ہیں خدمت کرنے کے لئے''۔

''ارے ہٹ'' اماں ناگواری سے بولیں ''تو کیا بیٹیوں کو بھی بیٹے کی طرح پڑھا لکھا کر ڈاکٹر، انجینئر بنایا جائے گا''۔

''بالکل......'' منظور صاحب اپنی ماں کو سمجھانے لگے۔ ''بالکل بیٹیوں کو بھی خوب پڑھانا چاہئے۔ اپنے ملک میں ہزاروں ایسے خاندان ہیں جنہوں نے پیسہ کمانے کے لئے بیٹوں کو پڑھا لکھا کر امریکہ اور انگلینڈ بھیج دیا اور آج وہ ان کے انتظار میں نظریں گڑائے بیٹھے ہیں''۔

''تو کیا کریں بیچارے سات سمندر پار کمانے جو گئے ہیں۔ آنے میں پریشانی تو ہوگی ہی......'' اماں نے لڑکوں کی حمایت میں کہا۔ ان کی نظر میں بیٹوں کا سات خون معاف تھا۔ ان کی غلطیوں کو غلطی نہیں سمجھتی تھیں، کیونکہ وہ بیٹے ہوتے ہیں۔

''ہاں مگر اماں ایک وقت ایسا آتا ہے کہ بیٹے گوری لڑکی سے شادی کر کے اسی ملک کے ہو جاتے ہیں اور اپنے بیوی بچوں میں مست ہو جاتے ہیں۔ ان کے والدین کی آنکھیں ان کے انتظار میں پتھرانے لگتی ہیں اور پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب بوڑھے ضعیف ماں باپ کے آخری وقت میں وہی لڑکیاں کام آتی ہیں جن کے حق کا اچھا کھانا ناشتہ بیٹوں کو کھلایا جاتا تھا کہ بیٹا ہے''۔

''تو کیا ایسا بھی ہوتا ہے''...... اماں بیٹوں کے خلاف سن کر بولیں۔

''اماں...... آج بوڑھے ماں باپ بڑی بڑی کوٹھیوں میں تنہا پڑے ہیں، جن کو کوئی دو

روٹی دینے والا نہیں ہے۔ جن بیٹوں پر ان کو ناز تھا کہ ان کے آخری وقت میں لاٹھی کا سہارا بنیں گے وہ پلٹ کر بھی نہیں پوچھتے کہ زندہ ہیں یا مر گئے''۔ منظور صاحب نے اپنی ضعیف العقیدہ ماں کو بہت سمجھایا مگر وہ کسی طرح ماننے کو تیار نہیں ہوئیں کہ اگر بیٹا نہیں ہوگا تو پھر گھر میں چراغ کون جلائے گا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں جب اسکول بند ہو گئے تو منظور صاحب نے اپنی فیملی کو اپنے وطن پہنچا دیا اور خود ہوٹل میں کھانے لگے...... لکھنؤ میں اس زمانہ میں کھانے کے کئی ہوٹل بہت مشہور تھے جہاں ملازم پیشہ حضرات روزانہ ماہانہ ادائیگی کی بنیاد پر کھانا کھاتے تھے۔ ان تمام ہوٹلوں میں سب سے مشہور لال باغ کا ''عزیز ہوٹل'' تھا۔ اس ہوٹل کے تقریباً نوے فیصد گاہک ماہانہ ادائیگی والے نوکری پیشہ حضرات تھے۔

ہوٹل عزیز میں اس زمانہ میں پچاس روپیہ ماہوار میں دونوں وقت بکرے کا گوشت، دال چاول، صلاد اور چٹنی وغیرہ کھلاتے تھے۔ بریانی یا مٹر پلاؤ کے لئے علیحدہ ادا کرنا ہوتا تھا جو مہینہ میں بمشکل پانچ روپیہ کا اضافہ کرتا تھا...... کھانے کا اتنا عمدہ اور اچھا نظام لکھنؤ شہر کے علاوہ یو پی کے دوسرے شہر میں نہیں تھا۔

ماں کی بیماری کی اطلاع ملتے ہی منظور صاحب پریشان ہو گئے۔ اور فوراً بذریعہ ٹرین روانہ ہو گئے۔ گھر پہنچ کر والدہ کو شہر کے اچھے ڈاکٹر کو دکھایا اور ایک ہفتہ اپنی والدہ کی چارپائی کے پائتانے بیٹھے، ان سے باتیں کرتے رہے، یا صرف ان کو محبت بھری آنکھوں سے دیکھتے رہے۔

ایک دن انہوں نے اپنی بیوی سے کہا:

''فرزانہ...... والدین کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھنا بھی ایک مبرور حج کے ثواب کے برابر ہے''۔

''بیشک'' انہوں نے جواب دیا۔

''فرزانہ...... تم کو تو اس بات کا علم ہے کہ میں بچپن میں یتیم ہو گیا تھا، میری اسی ضعیف

ماں نے مجھے پڑھایا لکھایا اور اس لائق بنایا کہ میں آج سماج کا ایک باعزت شہری اور سرکاری ملازمت میں ہوں''۔

''اس میں کیا شک ہے امّی جان نے بڑی مشقت کی زندگی بسر کی ہے، اب ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی خدمت میں کوئی کمی نہ کریں''۔ فرزانہ نے جواب دیا۔

''بہت صحیح کہا تم نے فرزانہ...... مجھے تم سے یہی اُمید تھی''۔ منظور صاحب نے کہا۔

منظور صاحب کی والدہ جب صحت یاب ہو گئیں تو وہ واپس لکھنؤ چلے آئے اور گھر سے قریب ایک ہوٹل میں کھانا کھانے لگے۔ امین آباد میں آج جس جگہ ہندوستان کا مشہور و معروف ''ٹنڈے کے کباب'' کی دُکان ہے وہاں کبھی ایک ''ہوٹل ڈی شیراز'' ہوا کرتا تھا۔ ہوٹل کے مالک رئیس احمد نے اس کے افتتاح کا ایک کارڈ منظور صاحب کو بھی دیا تھا جو لکھنؤ کے سماجی اور ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکے تھے۔ لہٰذا منظور صاحب اسی ''ہوٹل ڈی شیراز'' میں ماہانہ ادائیگی کی بنیاد پر پچاس روپیہ مہینہ پر روزانہ دونوں وقت بکرے کا گوشت، دال چاول وغیرہ کھانے لگے۔ اتنا لذیذ اور اچھا کھانا دنیا میں سوائے لکھنؤ کے کہیں نہیں مل سکتا تھا۔

منظور صاحب بہت کنبہ پرور واقع ہوئے تھے۔ ہمیشہ خاندان کے افراد کی خبر لیتے رہتے تھے۔ خوشحال لوگوں کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے تھے، مگر پریشان حال کے لئے دل میں درد محسوس کرتے تھے اور کوشش ہوتی تھی کہ کیسے اس کو پریشانی سے نجات دلائی جائے۔ ہر ایک کی مدد کرنا اپنا فرضِ اوّلین تصور کرتے تھے۔ اسکول کھلنے کے بعد جب اپنے بیوی بچوں کو لینے گئے تو اپنی بیوہ بھابی سے ملاقات کے دوران کہا:

''بھابی جان...... شکیل یہاں رہ کر ٹھیک سے پڑھ نہیں پائے گا''۔

''ہاں!...... یہ بات تو ہے مگر......'' ان کی بھابی کچھ کہتے کہتے رُک گئیں۔

''بھائی جان کے انتقال کے بعد ان کے بچوں کی ذمہ داری چچا اور چچی پر آتی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں شکیل کو اچھی تعلیم کے لئے لکھنؤ لیتا جاؤں''۔ منظور

صاحب نے اپنی بھابی سے کہا۔

''بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے مگر منظور میاں۔ تمہارے خود بال بچے ہیں امی جان ہیں سب کی ذمہ داری تم پر ہے''۔ بھابی نے کہا۔

''بھابی جان...... اللہ ہی رزق دیتا ہے اور ساری پریشانیوں کا حل بھی اسی کے ہاتھ میں ہے......''منظور صاحب نے کہا۔

''مگر وہ تو ٹھیک ہے پھر بھی'' بھابی پھر کچھ کہتے کہتے رُک گئیں۔

''بھابی جان...... میرے ایک دوست فرمایا کرتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ ایک دروازہ بند کرتا ہے تو دس دروازے کھول دیتا ہے۔ اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے''۔ منظور صاحب نے کہا اور اپنی بھابی کی اجازت سے اپنے سگے بھتیجے شکیل کو تعلیم کی غرض سے لکھنؤ لیتے آئے۔ منظور صاحب کے بڑے بھائی اطہر حسین کے دو بیٹے فضیل اور شکیل تھے انہوں نے بڑے بیٹے فضیل کی شادی اپنی زندگی ہی میں کر دی تھی جو انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کر کے دبئی کے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بحیثیت انجینئر ملازم تھا اور اپنی ماں اور چھوٹے بھائی شکیل کی پوری ذمہ داری کے ساتھ کفالت کر رہا تھا۔ فضیل ان دونوں کا بیحد خیال رکھتا تھا کیونکہ شکیل ابھی چھوٹا تھا کہ اس کے والد اطہر صاحب کو اچانک کینسر تشخیص ہوا اور ایک مہینہ کی مختصر بیماری میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

منظور صاحب نے اپنے بچوں کے ساتھ اپنے بھتیجے شکیل کو بھی شہر کے اچھے اسکول میں پڑھایا۔ شکیل ذہین تھا لہٰذا منظور صاحب نے اسے اس کے بڑے بھائی فضیل کی لائن انجینئرنگ کی تعلیم دلائی۔ جلد ہی وہ تعلیم سے فارغ ہو گیا اور صوبائی حکومت کے ایک محکمہ میں بحیثیت انجینئر پوسٹنگ ہو گئی۔ منظور صاحب نے اطمینان کی سانس لی اور اپنی بھابی سے مخاطب ہو کر بولے۔

''بھابی جان...... مجھے بڑی خوشی ہے کہ شکیل انجینئر ہو گیا''۔

''ہاں منظور میاں...... یہ سب تمہاری کوششوں کا نتیجہ ہے، ورنہ میں عورت ذات کیا

کر سکتی تھی‘‘۔ بھابی نے جواب دیا۔

’’نہیں بھابی جان...... آپ ایسا نہ کہئے...... ہم لوگوں کی موجودگی میں آپ کو کسی طرح کی پریشانی اٹھانے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہئے......‘‘ منظور صاحب نے کہا۔

’’وہ تو سب ٹھیک ہے...... فضیل اور تم ہر طرح سے خیال کرتے ہو۔ فضیل ہر ماہ بلاناغہ پیسہ بھیجتا ہے مگر صرف پیسہ ہی سے سارے کام نہیں ہوتے، کسی کی سرپرستی بھی ضروری ہوتی ہے، جو تم نے بخوبی نبھائی‘‘۔ بھابی جان نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا۔

’’بھابی...... اب آپ ایک اچھے خاندان کی خوبصورت لڑکی تلاش کر کے جلد از جلد شکیل کی شادی کر دیجئے اور بے فکر ہو جایئے‘‘۔

’’ٹھیک ہے‘‘ انہوں نے جواب دیا۔

شکیل کی شادی بڑے دھوم دھام سے ہوئی۔ اس کا بڑا بھائی فضیل اپنے بیوی بچوں کو لے کر دبئی سے آیا۔ منظور صاحب مع خاندان کے بحیثیت چچا اور سرپرست شامل ہوئے۔ بڑے تزک و احتمام کے ساتھ بارات گئی اور دلہن کو رخصت کرا کر لے آئی، مگر شادی کے دوسرے ہی دن منظور صاحب کے کانوں میں یہ بات گئی کہ دلہن نے صبح کو اس بات پر ہنگامہ کر دیا کہ اس کو بیڈ ٹی نہیں دی گئی، جس کی وہ عادی ہے۔ پورے گھر میں خوشی و مسرت کا خوشگوار ماحول ماتم جیسے ماحول میں تبدیل ہو گیا۔ ہر طرف چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ یا اللہ یہ کیا ہو گیا۔ منظور صاحب نے اپنی بھابی سے پوچھا۔

’’بھابی جان...... یہ کس خاندان کی لڑکی ہے‘‘؟

’’بھیا...... خاندان اچھا ہے لوگ بھی شریف ہیں اور سب سے بڑی بات کہ میری بیسوں سالوں کی ملاقات ہے۔ کسی طرح کی کوئی کمی نظر نہیں آتی‘‘ ...... بھابی نے جواب دیا۔

’’بھابی جان...... کیا لڑکی کے دادا دادی حیات ہیں‘‘؟

’’ہاں‘‘

''کیا وہ لوگ ساتھ رہتے ہیں''؟

''نہیں وہ گاؤں میں اپنے آبائی مکان میں رہتے ہیں''۔

''ایسے خاندان کے بچوں میں بڑوں کی عزت اور خدمت کا جذبہ کم ہوتا ہے۔ یہ بڑی اہم بات ہے جسے اکثر لوگ نظر انداز کر جاتے ہیں۔ چلئے کوئی بات نہیں...... وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے''۔ منظور صاحب نے لمبی سانس لی اور باہر چلے گئے۔

ایک دن منظور صاحب نے اپنے بھتیجے شکیل سے کہا۔

''شکیل...... تم بچپن سے دیکھ رہے ہو کہ مجھے لکھنؤ شہر سے کتنا لگاؤ ہے۔ تم سب کی تعلیم اسی شہر میں ہوئی۔ میرے سارے دوست احباب اسی شہر میں ہیں''۔

''جی مجھے معلوم ہے''۔ شکیل نے جواب دیا۔

''میرے کہنے کی غرض یہ ہے کہ تم جب اپنا مکان بنانے کے لئے زمین پسند کرنا تو میرے لئے بھی خیال رکھنا۔ اب آخری عمر میں لکھنؤ چھوڑ کر کہاں جاؤں گا''...... منظور صاحب نے اپنا مدعا بیان کر دیا۔

''بہت بہتر چچا جان...... میں اس بات کا دھیان رکھوں گا''۔ شکیل نے جواب دیا۔

مگر معاملہ بالکل اس کے برعکس ہوا۔ شکیل نے کب زمین خریدی، کب مکان بنوایا اور کب اس میں منتقل ہو گیا، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ منظور صاحب کے کانوں میں جب یہ بات پہنچی تو ان کو دلی تکلیف ہوئی۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ آخر کیا وجہ ہوئی کہ یہ سارا کام پوشیدہ طریقہ سے کیا گیا۔ ان کو اس بات کا غم کھائے جا رہا تھا کہ جس بھتیجے کو گاؤں سے لا کر لکھنؤ جیسے شہر میں تعلیم دلائی، انجینئر بنایا اس نے ایسی بے رُخی کیوں اختیار کی۔ منظور صاحب کے دوست احباب اور رشتہ داروں نے ان کو بہت سمجھایا کہ غم نہ کیجئے بلکہ بھول جائیے...... یہ نیا زمانہ ہے جہاں رشتوں کی قدروں کو لوگوں نے فراموش کر دیا ہے۔ والدین اپنے بچوں کی طرف حسرت

بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ کب میرا بیٹا خیریت دریافت کرنے آئے گا۔ مگر بیٹے صاحب اپنے والدین سے لاپرواہ اپنی بیوی بچوں میں بے فکری کی زندگی جی رہے ہیں۔ ان کو اس بات کی بھی فکر نہیں کہ ہم نے تو اپنے بچوں کے ساتھ بریڈ، مکھن، جیلی اور جام کا ناشتہ کرلیا، ہمارے ماں باپ نے کچھ کھایا یا نہیں؟...... ان ساری حقیقت سے منظور صاحب بھی واقف تھے مگر ان کا دل اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ شکیل نے یہ سب اپنی مرضی سے کیا ہے۔ انہیں اپنے بھتیجے پر پورا اعتماد تھا کہ شکیل اپنے اس چچا کو عمر کے آخری حصہ میں تنہا نہیں چھوڑے گا جو اس کو بیحد عزیز رکھتے تھے۔ ان کے کسی بے تکلف دوست نے ایک دن ان سے کہا۔

''منظور...... پتہ نہیں یہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ اس شخص کے شر سے بچو جس پر تم نے کبھی احسان کیا ہو''۔ ان کا اشارہ شکیل کی بے اعتنائی کی جانب تھا۔

''مگر تم یہ مت بھولو کہ میں نے شکیل پر کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ وہ میرا ہی خون ہے بحثیت ایک حقیقی چچا میں نے اپنا فرض نبھایا، لہٰذا اگر یہ حدیث صحیح بھی ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا''۔ منظور صاحب نے اپنے دوست کو جواب دیا۔

''پھر کیا ہوسکتا ہے۔ شکیل نے ایسا کیوں کیا؟'' ان کے دوست نے دریافت کیا۔

''بہت سے گھریلو معاملات میں عورتوں کا دخل ہوتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ شکیل کی امیر زادی بیوی نے اپنی کسی عزیز سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ ہم نہیں چاہتے کہ چچا جان لکھنؤ میں سکونت اختیار کریں''۔ منظور صاحب نے اپنے دوست کو جواب دیا۔

منظور صاحب خیالوں کی دُنیا میں کھو گئے۔ سوچنے لگے کہ گذشتہ پچاس سالوں سے لکھنؤ کو اپنا وطن سمجھ کر رہ رہا ہوں کیا اس عزیز شہر کو چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ وہ لکھنؤ جہاں جوانی گذری، شہر کے ہر طبقہ میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھا گیا۔ مشاعروں اور ادبی نشستوں میں ان کی موجودگی درج کی گئی۔ اُردو زبان وادب سے وابستگی سے شہر کے ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ کیا یہ سب ترک کر کے عمر کے آخری دور میں دیارِ غیر میں زندگی بسر کرنی پڑے گی۔

انہوں نے سوچا کہ لکھنؤ کی تہذیب، اُردو زبان وادب، لکھنوی روایات، نشست و برخاست کے مہذب طور طریقے کے علاوہ ادبی اور مذہبی ماحول سے متاثر ہو کر اُردو ادب کے بہت سے نامور مشہور و معروف ادیبوں، شعراء اور دانشوروں نے اس خوبصورت شہر کو اپنا وطن ثانی بنایا مگر وہ زندگی بھر ملیح آبادی، سندیلوی، ردولوی، کاکوروی اور بارہ بنکوی لکھتے رہے۔ ان حضرات نے اپنی بے مثال خدمات سے اس عظیم شہر کو اُردو ادب کا گہوارہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا اور اسے فخریہ وطن ثانی کا درجہ دیا۔

منظور صاحب ان ہی خیالوں میں گم تھے کہ دبئی سے ان کے بڑے بھتیجے فضیل کا فون آیا کہ وہ خاص طور سے ان سے ملنے کل لکھنؤ پہنچ رہا ہے۔ منظور صاحب بڑے تذبذب میں مبتلا ہو گئے کہ آخر فضیل کو ان سے کون سا ضروری امر پیش آ گیا کہ وہ مجھ سے ملاقات کی غرض سے آ رہا ہے۔ انہوں نے یہ بات اپنی بیوی فرزانہ سے بھی کہی کہ اس کا اچانک آنا میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ فرزانہ بھی کوئی معقول وجہ نہ سمجھ سکیں اور گہری کشمکش میں سب مبتلا رہے، لیکن منظور صاحب اپنے بڑے بھتیجے فضیل کے حسن اخلاق کے ہمیشہ سے قائل تھے، لہٰذا اطمینان تھا کہ کوئی اچھی ہی بات ہوگی۔

فضیل جب اپنے چچا منظور صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ کیم شحیم شخصیت کے ایک اجنبی شخص بھی تھے۔ فضیل نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ان کا تعارف کرایا۔

''چچا جان...... یہ میرے دوست اشرف ہیں جو لکھنؤ کے رہنے والے ہیں اور شارجہ میں تجارت کرتے ہیں۔ انہوں نے لکھنؤ میں بلڈر کی حیثیت سے اپارٹمنٹ بنا کر فروخت کرنے کا کام شروع کیا ہے''۔

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر''۔ منظور صاحب نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔

''چچا جان......'' فضیل نے کہنا شروع کیا۔ ''ان کے پہلے پروجیکٹ میں، میں نے آپ اور چچی جان کے لئے دو بیڈ روم کا ایک فلیٹ خرید لیا ہے''۔

''ارے بیٹا...... اس کی کیا ضرورت تھی۔ ہم رہ تو رہے ہیں''۔ منظور صاحب نے کہا۔

''رہ رہے ہیں مگر کرائے کے اس مکان میں، جس میں رہ کر آپ نے اپنے بچوں کے ساتھ میرے چھوٹے بھائی شکیل کی بھی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری نبھائی...... پتہ نہیں کب اسے خالی کرنا پڑے......''فضیل نے کہا۔

''تم بلاوجہ پریشان ہو رہے ہو...... اب تو ہم لوگ زندگی کے آخری دور میں ہیں...... ٹمٹماتا ہوا چراغ ہیں ہم''۔ کہہ کر منظور صاحب نے اپنی ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں ڈھک لیں جو اشکبار ہو چکی تھیں۔

''چچا جان ...... چلئے جلد تیار ہو جایئے، ہمیں ابھی قیصر باغ کچہری پہنچ کر فلیٹ کی رجسٹری کرانی ہے۔ ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں...... کیوں اشرف''؟ فضیل نے اشرف کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''جی ہاں......'' اشرف نے پہلی بار زبان کھولی اور بولے ''بس آپ کے چلنے کی دیر ہے۔ آپ کو صرف چند جگہوں پر اپنے دستخط کرنے ہیں''۔

فضیل کے چچا کے نام فلیٹ کی رجسٹری کرا کر آنے کے بعد اشرف نے فلیٹ کی چابی منظور صاحب کے حوالے کر کے دُعا کی درخواست کی۔ دوسرے دن فضیل اور اشرف دبئ کے لئے روانہ ہو گئے۔

(روزنامہ ''آگ''، لکھنؤ۔ ۳۱ر دسمبر ۲۰۱۲ء/ یکم جنوری ۲۰۱۳ء)

......☆......

ادبِ اطفال کا نقیب ماہنامہ ''ٹافی''

نصف صدی قبل ہندوستان کے تقریباً ہر صوبہ سے اُردو زبان میں بچوں کا کوئی نہ کوئی رسالہ ضرور نکلتا تھا۔ ہر مسلم گھرانے کا بچہ اردو زبان سے واقف تھا۔ اُردو پڑھنا اور لکھنا جانتا تھا۔ لہٰذا بچوں کے لئے شائع ہونے والے اپنے پسندیدہ رسالہ کا ہر ماہ بڑی بے صبری سے انتظار کیا کرتا تھا۔ دہلی سے شمع پبلی کیشن سے بچوں کا رسالہ ''کھلونا'' جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ''پیامِ تعلیم'' پٹنہ سے ''مسرت'' بمبئی سے ''مٹھائی'' بریلی سے ''بچپن'' مراد آباد سے ''چندا نگری'' کلکتہ سے ''غنچہ'' رام پور سے ماہنامہ ''نور'' بچوں میں بیحد مقبول تھے۔ اودھ کی راجدھانی اور اُردو زبان و تہذیب کے مرکز لکھنؤ سے ماہنامہ ''ٹافی، کلیاں اور چندا دیش'' شائع ہوتا تھا۔ ماہنامہ ''کلیاں'' اُردو کے مقبول ناول نگار اور عورتوں کے پسندیدہ رسالہ ''حریم'' کے ایڈیٹر نسیم انہونوی کے صاحبزادے شمیم انہونوی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ ماہنامہ ''چندا دیش'' لکھنؤ کی بچوں کی ایک انجمن ادبِ اطفال کے زیرِ اہتمام شائع ہوا مگر چند شمارہ کے بعد بند ہو گیا۔

اس زمانہ میں ادبِ اطفال پر لکھنے والوں کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ ملک کے نامور شاعر اور ادیب بچوں کے لئے معیاری نظمیں، ڈرامے اور کہانیاں لکھ رہے تھے۔ جسے بچے بہت دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ ان کی تخلیقات کو بچوں کے علاوہ بڑے بھی شوق سے پڑھتے تھے۔ بچوں اور بڑوں میں یکساں دلچسپی لینے کے مدنظر بچوں کے رسالوں کو آٹھ سے اسی سال کے بچوں کا رسالہ کہا جاتا تھا۔ بلاشبہ اس زمانہ میں بچوں کے لئے لکھی گئی کہانیاں اور نظمیں معیار کی اعلیٰ بلندیوں کو چھو رہی تھیں جس کی ایک ہلکی سی جھلک اس مضمون میں دیکھنے کو ملے گی۔

۱۹۶۱ء میں لکھنؤ کے ایک اُردو نواز، اُردو سے والہانہ محبت کرنے والے اُردو زبان کی

خدمت کے جذبہ سے سرشار لکھنوی تہذیب وتمدن کے نمائندہ شیروانی ٹوپی میں ملبوس معظم جعفری صاحب نے لکھنؤ سے بچوں کے رسالہ ماہنامہ ''ٹافی'' کی داغ بیل ڈالی اور اپنے دفتر واقع لاٹوش روڈ (موجودہ گوتم بدھ مارگ) سے شائع کیا۔ معظم جعفری اس رسالہ کے پرنٹر پبلشر اور مالک تھے۔ اس رسالہ کو حفیظ نعمانی کے تنویر پریس سابق باغ گونگے نواب (موجودہ پرتاپ مارکیٹ) امین آباد میں چھپوایا جاتا تھا۔ کاتب مسطر پر ایک مخصوص روشنائی سے کتابت کرتے تھے جسے لیتھو مشین پر چھاپا جاتا تھا۔ گزشتہ چالیس سالوں میں حالات میں زبردست تغیر آیا ہے۔ کتابت کی جگہ کمپیوٹر کی کمپوزنگ نے لے لی اور لیتھو مشین اب قصہ پارینہ بن گئی۔ آٹو میٹک پرنٹنگ مشینوں سے چھپائی ہونے لگی، گھنٹوں کا کام منٹوں میں ہونے لگا۔

معظم جعفری صاحب نے اپنے رسالہ کی ادارت کی ذمہ داری لکھنؤ کی کئی ادبی شخصیتوں کو سونپی جن میں سب سے اہم احمد ابراہیم علوی، اور ڈاکٹر اوصاف احمد کے نام شامل ہیں۔ اوصاف احمد نے کافی عرصہ تک ماہنامہ ٹافی کی ادارت کی۔ ہندوستان کے موجودہ ماہر معاشیات اور اسلامک بینکنگ کے لئے مشہور شخصیت اوصاف احمد اعلیٰ تعلیم کی غرض سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے بعد ٹافی کی ادارت کی ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہو گئے۔ احمد ابراہیم علوی نے اپنے ہفت روزہ اخبار ''آگ'' پر زیادہ سے زیادہ وقت دینے کا فیصلہ کیا۔ انکی توجہ اپنے اخبار پر مرکوز ہو گئی۔ لہٰذا ۱۹۶۷ء میں معظم جعفری نے اپنے ماہنامہ ٹافی کی ادارت کی ذمہ داری اس ناچیز کو سونپی۔ ماہنامہ ٹافی کا میں مسلسل پانچ سال تک مدیر رہا اور یہ رسالہ ۱۹۷۲ء میں لکھنؤ سے گورکھپور میرے تبادلہ کے بعد بند ہو گیا۔

اس دور میں دہلی سے شائع ہونے والا بچوں کا رسالہ ''کھلونا'' اپنے عروج پر تھا اور بچوں میں بہت ہی مقبول تھا، جس میں ہندو پاک کے عظیم شعراء اور ادباء کی تخلیقات ہر ماہ شائع ہوتی تھیں۔ کھلونا کو شفیع الدین نیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی، رضیہ سجاد ظہیر، مرزا ادیب، عظیم بیگ چغتائی اور قتیل شفائی وغیرہ کا تعاون حاصل تھا۔ وہ یہ بلند پایہ کے شاعر اور ادیب تھے جن کی

تخلیقات ہر ماہ ماہنامہ ''شمع'' میں شائع ہوتی تھیں اور کھلونا شمع کے ادارہ سے شائع ہوتا تھا۔

ہندوستان کے وہ تمام نامور شاعر اور ادیبوں سے جن کا تعلق لکھنؤ یا ہندوستان کے دیگر شہروں سے تھا، ٹافی کے مدیر کے خصوصی تعلقات تھے، جن میں قابل ذکر شخصیتیں ہیں اُردو کے ممتاز اور مشہور افسانہ نگار رام لعل (محکمہ ریلوے میں میرے ہم منصب تھے) بچوں کے عظیم اور بزرگ کہانی نگار علی عباس حسینی، روزنامہ قومی آواز کے احمد ابراہیم علوی، سی ڈی آر آئی لکھنؤ کے سائنسداں اور اُردو کے مقبول افسانہ نگار ڈاکٹر بشیشر پردیپ، سنبھل (مراد آباد) کے ڈگری کالج کے ڈاکٹر سعادت علی صدیقی، اُردو ادب میں گنے چنے مزاحیہ ادیبوں میں ہندو پاک کے مقبول و معروف مزاحیہ ادیب احمد جمال پاشا، آکاش وانی بمبئی سے منسلک لکھنؤ کے مقبول شاعر احمد وصی کے علاوہ کیف احمد صدیقی، قدیر جاوید پریمی، شکیل انوار صدیقی، شکیل جاوید امروہوی، مناظر عاشق ہرگانوی، ناوک حمزہ پوری، عادل جعفری، اظہر افسر، مشتاق احمد نوری، ساجد صدیقی لکھنوی، سرپٹ لکھنوی وغیرہ۔ جنہوں نے ماہنامہ ٹافی کو بچوں کا ایک معیاری رسالہ اور شہرت کی بلندیوں تک پہنچانے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ ہندو پاک کے ادبی حلقوں میں اپنی جگہ بنائی اور جسے ہر طبقہ کے ادبا اور شعرا کا بھرپور تعاون حاصل ہوا۔

اس حقیقت سے ہر شخص واقف ہے کہ بچوں کے لئے لکھنا آسان نہیں ہے بلکہ بڑوں کے لئے لکھنے سے زیادہ مشکل ہے۔ بچوں کے لئے لکھتے وقت ادیب یا شاعر تھوڑی دیر کے لئے خود بچہ بن جاتا ہے، تب معیاری تخلیق کا وجود ہوتا ہے۔ بچوں کی نفسیات کو بہتر طریقہ سے سمجھنے کے بعد ہی کوئی اچھی تخلیق وجود میں آتی ہے۔ میں نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے مندرجہ بالا اُدبا و شعراء سے ٹافی کے لئے بہترین کہانیاں، ڈرامے اور نظمیں لکھوائیں جو بچوں کے ادب میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔

میں نے اس بات کا لحاظ رکھا تھا کہ ''ٹافی'' میں مشہور و معروف شعراء اور ادباء کے ساتھ نئے لکھنے والوں کی بھی ہمت افزائی کی جانی چاہئے۔ اس نظریہ کے تحت ان بچوں کی حوصلہ افزائی کی

گئی، جن میں تخلیقی صلاحیت کا مادہ تھا، یہ انسانی فطرت اور نفسیات کا تقاضہ ہے کہ ہر شخص اخبار یا رسالہ میں اپنا نام دیکھ کر خوشی محسوس کرتا ہے۔ میں نے ''ٹافی'' کو بڑوں اور بچوں کے رسالہ کے طور پر پیش کیا جس میں رام لعل اور علی عباس حسینی جیسی شخصیتوں کے ساتھ ان بچوں کی تخلیقات کو بھی جگہ دی گئی جنہوں نے اُردو ادب میں قدم رکھا تھا اور لکھنے کی ابتدا کی تھی۔ 'ٹافی' کی حوصلہ افزائی سے نئے لکھنے والوں میں اُردو میں لکھنے کا جذبہ پیدا ہوا اور مستقبل میں انہوں نے ادبی دنیا میں اپنا ایک اعلیٰ مقام حاصل کرلیا۔ ماہنامہ ٹافی رفتہ رفتہ شہرت اور ترقی کی منزلیں طے کرتا گیا اور ایک وقت آیا جب ٹافی ہندوستان کے ہر صوبہ کے ریلوے اسٹیشنوں پر اے ایچ ویلر کے توسط سے پہنچ گیا جہاں اُردو داں طبقہ کی اکثریت تھی۔ ۱۹۷۰ء میں دہلی کی ایک میٹنگ کے دوران کھلونا کے ایڈیٹر الیاس دہلوی نے 'ٹافی' کے معیار کی تعریف کی اور محض چالیس پیسے کے رسالہ کی مقبولیت کا راز جاننے کی خواہش ظاہر کی۔ (اس وقت کھلونا ۷۵ پیسے میں بک رہا تھا) الیاس صاحب کے ساتھ سبشتاں ڈائجسٹ کے انچارج لکھنؤ کے مقبول ادیب سلامت علی مہدی بھی موجود تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ نئے اور پرانے لکھنے والوں کی رسالہ میں شمولیت، بچوں کی ہمت افزائی کے لئے سوال وجواب کا کالم، لطیفے، خطوط، ٹافی معمہ اور ہر ادیب اور شاعر کا مختصر تعارف نامہ شائع کرنا اور ساتھ ہی ساتھ رسالہ کے آخری صفحہ کو اسلامیات کے لئے وقف کرنا رسالہ کی مقبولیت کا راز ہے۔ ''ٹافی'' کے آخری صفحہ پر تاریخ اسلام، صحابہ کرام کا کردار، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کوئی واقعہ جو بچوں کے ذہن پر مثبت اثر ڈالے ہر ماہ شائع کیا جاتا تھا۔ اس ملاقات کے بعد الیاس دہلوی نے اپنے رسالہ ''کھلونا'' میں ایک صفحہ اسلامی کہانیوں کے لئے وقف کردیا تھا۔

''ٹافی'' میں شائع ملک کے نامور کہانی کار اور افسانہ نگاروں کی نثری تخلیق کو اس مضمون میں شامل کرنا ممکن نہیں ہے، مگر بچوں کے لئے لکھی گئی پیاری پیاری نظموں کو جگہ دی گئی ہے جس سے بچوں کے ادب میں شعراء کی شرکت اور اس کے معیار کا اندازہ بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے۔ لکھنؤ شہر پوری دنیا میں مشہور ہے۔ لکھنؤ کی یاد سے ہر اس شخص کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے

جس کا بچپن اس خوبصورت شہر میں گذرا ہے۔ بچوں کے شاعر جاوید اقبال ٹافی کے اپریل ۱۹۶۸ء کے شمارہ میں اپنی نظم ''لکھنؤ کی سیر'' یوں کرار ہے ہیں۔

چار باغ اسٹیشن دیکھو — شہر میں ایک نیا پن دیکھو
بجی سجائی دلہن دیکھو — قدم قدم پر فیشن دیکھو
آؤ تمہیں لکھنؤ دکھائیں — اور یہاں کی سیر کرائیں
حضرت گنج کی سیر کرائیں — قیصر باغ کی لاٹ دکھائیں
اور امین آباد گھمائیں — شامِ اودھ رنگین بنائیں
آؤ تمہیں لکھنؤ دکھائیں — اور یہاں کی سیر کرائیں
یہ پوری یوپی کا دل ہے — اس میں ایک چھتر منزل ہے
آرٹ اسکول لب ساحل ہے — ندوہ دیکھنے کے قابل ہے
آؤ تمہیں لکھنؤ دکھائیں — اور یہاں کی سیر کرائیں
چوک، نخاس، حسین آباد — گولہ گنج، نظیر آباد
پیار محبت میں آزاد — مرد و زن شیریں فرہاد
آؤ تمہیں لکھنؤ دکھائیں — اور یہاں کی سیر کرائیں
آؤ شہید اسمارک دکھائیں — جھنڈے والے پارک میں جائیں
بیلی گارد کو سمجھائیں — میڈیکل کالج دکھلائیں
آؤ تمہیں لکھنؤ دکھائیں — اور یہاں کی سیر کرائیں

بچوں کے مقبول شاعر شفیع الدین نیر نے ''ٹافی'' کے لئے خصوصی طور پر نظم ''شرارت کا مزہ'' ارسال کیا تھا جو جنوری ۱۹۶۹ء کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی۔

ایک لڑکے کا نام تھا ارشد — نام تھا ارشد کام تھے سب بد
دن بھر خوب شرارت کرتا — پھر بھی اس کا پیٹ نہ بھرتا

اس کو چھوا اس چیز کو توڑا　　اس کو لیا اس چیز کو پھوڑا
ساتھی اس کے گھبراتے تھے　　دیکھتے ہی کترا جاتے تھے
اک دن کا ہے ذکر ہوا کیا　　آپ نے دیکھا شہد کا چھتا
دیکھتے ہی بس کھیل یہ کھیلا　　مارا اس پر تاک کے ڈھیلا
مکھیاں پہلے تو گھبرائیں　　پھر جھلاکر اس پر آئیں
سب نے مل کر اتنا کاٹا　　بھول گئے وہ سیر سپاٹا
پھول کے کپا ہوگئے ارشد　　روتے روتے سو گئے ارشد
پھر وہ سیدھے ہوگئے ایسے　　نیر سیدھی گائے ہو جیسے

بچوں کے ممتاز شاعر کیف احمد صدیقی سیتاپور کے ایک کالج ٹیچر تھے۔ ''ٹافی'' سے ان کو خاص نسبت تھی۔ بچوں کے امتحانات کے نتیجہ نکلنے کے بعد انہوں نے جون ۱۹۶۸ء کے ٹافی کے شمارہ کے لئے اپنی نظم ''امتحان کی کامیابی'' بھیجی تھی۔

نتیجہ سن کر کئی لوگ بدحواس ہوئے　　خدا کا شکر ہے، ہم امتحاں میں پاس ہوئے
صلہ ملا ہے ہمیں سال بھر کی محنت کا　　چمک رہا ہے ستارہ ہماری قسمت کا
یہی تو وقت ملا ہے ہمیں مسرت کا

جو فیل ہو گئے وہ اس قدر اُداس ہوئے　　خدا کا شکر ہے، ہم امتحاں میں پاس ہوئے
جو کھیل کود میں دن رات چور رہتے تھے　　ہر ایک کھیل میں شامل ضرور رہتے تھے
جو صبح و شام کتابوں سے دُور رہتے تھے　　جہاں میں آج وہی مبتلائے یاس ہوئے
خدا کا شکر ہے، ہم امتحاں میں پاس ہوئے

جنہیں تھا اپنی لیاقت پہ اعتبار بہت　　جنہیں خود اپنے قلم پر تھا اختیار بہت
جو اپنے آپ کو سمجھتے تھے ہوشیار بہت　　انہیں کے ہوش اڑے اور گم حواس ہوئے
خدا کا شکر ہے، ہم امتحاں میں پاس ہوئے

لکھنؤ کی ادبی دنیا کے مقبول اور ہر دل عزیز شاعر سلمان عباسی 'ٹافی' کے مداحوں میں سے تھے اور مدیر ٹافی کے مخلص دوست تھے۔ نئے سال کے موقع پر بڑی پیاری نظم ''نیا سال آیا'' ٹافی کے جنوری ۱۹۶۹ء کے شمارہ کے لئے ارسال کیا تھا۔

اندھیروں نے پردے میں منھ کو چھپایا ۔۔۔ اُجالوں نے آکر نیا گیت گایا
یکم جنوری نے یہ نغمہ سنایا ۔۔۔ نیا سال آیا نیا سال آیا
چراغوں میں پھر روشنی بڑھ رہی ہے ۔۔۔ دلوں میں امید خوشی بڑھ رہی ہے
سوئے زندگی، زندگی بڑھ رہی ہے ۔۔۔ نیا سال آیا نیا سال آیا
صبا لڑکھڑاتی ہوئی آرہی ہے ۔۔۔ بہار اپنی قسمت پر اِترا رہی ہے
کلی پھول سے بھی بڑھی جارہی ہے ۔۔۔ نیا سال آیا نیا سال آیا
ارادے جہاں کے جواں ہو رہے ہیں ۔۔۔ سنہرا ہے یہ وقت کیوں کھو رہے ہیں
جگا دو انہیں جو ابھی سو رہے ہیں ۔۔۔ نیا سال آیا نیا سال آیا

بچوں کے شاعر عادل جعفری اسلامیہ ڈگری کالج اندور میں فارسی کے لیکچرر تھے ''ٹافی'' سے خاص لگاؤ کی نسبت سے مزاحیہ نظم ''ابا کا چشمہ'' ارسال کیا تھا جو اکتوبر ۱۹۶۸ء کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی۔

کیا کر رہی ہیں آپ یہاں جلد آیئے ۔۔۔ امی! کہاں ہے ابا کی عینک بتایئے؟
رکھ کر کہیں اسے بھولے ہیں دیکھئے ۔۔۔ جھولے میں اتفاق کے جھولے ہیں دیکھئے
کیجئے جو کوئی بات تو جھنجھلا رہے ہیں وہ ۔۔۔ کالج کا وقت ہو گیا، جھلاّ رہے ہیں وہ
ان کی نظر میں اپنی ہی ہر چیز غیر ہے ۔۔۔ تکیہ ہے اپنی جا پہ نہ چادر بہ خیر ہے
چیزیں جو میز پہ تھیں وہ سب ہی پلٹ گئیں ۔۔۔ اِک ایک کر کے ساری کتابیں اُلٹ گئیں
کمرہ کا حال غیر ہے آکر بچایئے ۔۔۔ امی خدا کے واسطے اب آ بھی جایئے
امی یہ سن کے دوڑ کے آئیں بہ اضطراب ۔۔۔ ابا سے ہم کلام ہوئیں آتے ہی شتاب

عینک دھری ہے آپ کی پیشانی پہ جناب کیجئے درست جایئے کالج بہ صد شتاب

بچوں کے لکھنؤ کے کہنہ مشق شاعر احمد وصی ماہنامہ ''ٹافی'' کے فروری ۱۹۶۸ء کے شمارہ میں بڑی پیاری ''قوالی'' لے کر شامل ہوئے تھے۔

اپنی پڑھائی کا ہم سامان کر رہے ہیں یا اپنے ٹیچروں پر احسان کر رہے ہیں
ہم کو پڑھائی سے جب رغبت نہیں کوئی ہم جانتے ہیں اس سے عزت نہیں کوئی
اس سے کٹھن جہاں میں محنت نہیں کوئی کیوں ظلم مجھ پہ ابا نادان کر رہے ہیں

لکھنؤ کے بزرگ شاعر ساجد صدیقی لکھنوی نے اپنی نظم ''علم'' میں بچوں کو علم کی اہمیت سے آگاہ کیا ہے۔ ان کی نظم اپریل ۱۹۶۸ء کے ٹافی کے شمارہ میں شامل اشاعت ہوئی تھی۔

علم سے اپنی شان ہے یارو علم سے اپنی آن ہے یارو
علم سے عزت وطن بھی ہے علم سے حرمت چمن بھی ہے
علم حاصل ہے زندگانی کا علم حاصل ہے کامرانی کا
آؤ مل جل کر ہم پڑھیں یارو سیدھے رستے پہ ہم چلیں یارو

لکھنؤ کے مزاحیہ شاعر سرپٹ لکھنوی کی مزاحیہ نظم ''آج کی تازہ خبر'' ٹافی کے فروری ۱۹۶۸ء کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی۔

آج اک تازہ خبر آئی ہے انبالہ سے لاش اِک ہاتھی کی نکلی ہے کسی نالے سے
ڈاکٹر دیکھ کے بولا یہ اسے آلے سے یہ مرا زہر سے نا قتل ہوا بھالے سے
مر گیا بھوک میں یہ کھا کے کہیں کچی مٹر آج کی تازہ خبر آج کی تازہ خبر

مضمون کے آخر میں ناوک حمزہ پوری کا منظوم خط پیش ہے جو فروری ۱۹۷۰ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔

اے صبا! جا رہی ہے آج کدھر ہو اگر شہر لکھنؤ میں گزر
محترم محتشم مکرم کو حضرت جعفری معظم کو

کہنا بصد ادب سلام مرا
اور بعد اس کے یہ پیام مرا

آپ کے نامہ و پیام ملے
دو دو ثانی بھی آج شام ملے

واہ و ازک و احتشام ان کے
مرحبا پیارے پیارے نام ان کے

سرورق ان کے دلکش و احسن
اندرون ورق بھی مستحسن

فیض اُردو کو آپ پہنچائیں
کیوں کر ہم آپ کے نہ گن گائیں

امن و عادل مناظر و اختر
کیف و جاوید انجم ومحشر

شامل بزم ثانی ہیں یہ لوگ
پڑھنے والوں کو کافی ہیں یہ لوگ

ناوکؔ ایسے بھی ہوگئے مشہور
ہے یہ بس فیضِ احمد مشکور

(روزنامہ ''آگ'' لکھنؤ۔ مورخہ ۴/۵/مئی ۲۰۱۱ء
ہفت روزہ ''مسرت'' نئی دہلی۔ ۱۸ سے ۲۴ رجون ۲۰۱۱ء)

......☆......

احمد مشکور

تصانیف

۱۔ انجمن شمع ادب گورکھپور کی جانب سے کتابچہ ''نئی شمع نئے پروانے'' ساجدی پریس سے 1958ء میں شائع کیا۔

۲۔ جاسوسی ناول ''سونے کی لاش'' ظفر پبلی کیشن الہ آباد سے 1960ء میں شائع ہوئی۔

۳۔ بچوں کیلیے ناول ''ننھے جاسوس'' لکھی جو ٹافی پبلی کیشن نے 1968 میں شائع کی۔

۴۔ امریکہ کے سفر کے مشاہدات بعنوان ''امریکن مسلم'' روزنامہ ''آگ'' لکھنؤ میں ۲۲ قسطوں میں شائع ہوئی اور اب کتابی شکل میں مشہود انٹر پرائزز سے 2012 میں شائع ہوکر منظر عام پر آگئی ہے۔

۵۔ حج بیت اللہ کا مبارک سفرنامہ اور مکمل ارکانِ حج و عمرہ کتابچہ ''سوئے حرم'' اُردو اور ہندی میں شائع ہوئی۔

۶۔ اپنے وطن کی تاریخ اور خاندانی شجرہ بعنوان ''تاریخ الہری ہانس'' مرتب کر کے شائع کیا۔

۷۔ ماہنامہ ''ٹافی'' لکھنؤ کی پانچ سال ادارت کی۔